معارف

جولائی ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپئے

دیگرممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپئے۔ دیگرممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI
196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN
LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN
Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپواکر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۶ ماہ ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۲۰ء عدد ۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

خدا جانے کب تک کورونا کا عذاب، گفتگو کا موضوع رہے گا، اس مرض کی وجہ، ماہیت اور انسان پر اس کے اثرات بد کی تحقیق و تجزیہ اور پھر اس کا مداوا، اس وقت علم و حکمت کی تجربہ گاہوں کا گویا تنہا مقصد ہے، مرض ہے تو یقیناً تکوینی مشیت نے اس کا علاج بھی رکھا ہوگا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ کچھ ایسے ذہن بھی ہیں جن کی قوت مدافعت اب بالکل ہی جواب دے چکی ہے اور وہ اب ایسے عالم جنوں میں ہیں کہ جو ان کے منہ سے نکلتا ہے اس کو صرف ہذیان ہی کا نام دیا جاسکتا ہے، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے دور حکومت یا زمانہ خدمت پر موافق اور مخالف تحریروں اور تقریروں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس میں حکمرانوں اور عوامی طبقات کے طرز عمل پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں لیکن ایسا غالباً پہلی بار ہوا کہ ایسے بزرگوں کی شان میں بھی زبان درازی کی گئی جن سے محبت و عقیدت صدیوں کی عوامی روایت بن چکی ہے، خواجہ معین الدین اجمیری اس روایت کا وہ نقطۂ آغاز ہیں جن کے وجود سے زمینوں تک کو شہرت و فضیلت حاصل ہوئی، اجمیر کی ناہموار پہاڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کی زمین خواجہ صاحب کی برکت سے سرزمین جنت آئین کہلائی، جہاں صاحبانِ تخت و تاج، پلکوں سے جھاڑو دینے اور مزار کی خوشبودار خاک کو توتیائے چشم بنانے کی حسرت کرتے اور وہاں کی شام کو صبح سے بہتر سمجھتے، خواص کا یہ عالم کہ خواجہ صاحب کی شخصیت کے لیے قطب المشائخ، ملک المشائخ، سلطان السالکین، منہاج المتقین جیسے القاب و آداب و خطابات کے موتیوں کی نہ ختم ہونے والی لڑی بھی ان کے جذبات کی ترجمانی کے لیے کافی نہیں، محبت و عقیدت یوں بھی حدوں کی عادی نہیں، لیکن جو ان حدوں کے پابند نہیں ان کے لیے بھی خواجہ صاحب کی سیرت کے جلوؤں کی روشنی میں دلکشی ہی دلکشی نظر آتی ہے، مورخوں نے لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کی طبیعت میں حلم و عفو کی درویشانہ صفات منتہائے کمال تک پہنچی ہوئی تھیں ان کا قول ہمیشہ اس عمل میں ڈھلا نظر آیا کہ "ہم درویشوں کا یہ شیوہ ہے کہ کوئی ہم سے بدی بھی کرتا ہے تو ہم اس کے ساتھ نیکی سے پیش آتے ہیں"، وہ خود فقیر و درویش تھے لیکن خانقاہ میں شاہانہ فیاضیوں کا دریا بہتا، بے شمار غربا و مساکین روزانہ شکم سیر ہوتے، حاجت مندوں کی برآری کے لیے

اوراد و وظائف میں مشغول انسان کے لیے لازم قرار دیا کہ پہلے وہ حاجت مندوں کی خدمت میں مشغول ہو، خواجہ صاحب کی کرامتیں بہت بیان کی جاتی ہیں لیکن ہمارے نزدیک ان کی سب سے بڑی کرامت تو ایک ایسے خطہ میں پیغام حق سنانے کا عمل ہے جہاں بظاہر صرف غیروں کا عمل دخل تھا، ایسے ظلمت کدہ میں حق کی روشنی عام کرنے کی ہمت اور عزیمت بجائے خود سب سے بڑی کرامت ہے اور اس سے بھی زیادہ زبان کی وہ لطافت اور دل کی وہ طہارت جس کی تاثیر سے کوئی محروم نہ رہتا، خواجہ صاحب کی سیرت کی یہ حقیقتیں تاریخ کے صفحات پر نقش ہوتی رہیں، ایسے میں اگر کوئی زبان ہرزہ سرائی سے سیاہ ہوجائے تو غم کے ساتھ غصہ عین فطری تقاضا ہے، موجودہ حالات میں اس کے اظہار کے جو طریقے مناسب تھے وہ بجا طور پر اختیار کیے گئے۔

یہاں پھر وہ اوراقِ پارینہ یاد آتے ہیں جہاں کبھی لکھا اور کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے بارہ سو برس سے بھی زیادہ ہوگئے مگر انہوں نے ہندوستان کے کسی رشی، مہاتما اور اوتار کے خلاف کبھی کوئی نازیبا بات یا حرکت نہیں کی، ہندوستان کے ان اوتاروں کا نبیوں سے ہونا مسلمانوں کو یقین سے نہیں معلوم، یہ صرف ایک امکانی بات ہے مگر مسلمانوں نے اس امکان کا بھی ہمیشہ پاس کیا، قریب سو سال پہلے معارف نے افسوس ظاہر کیا تھا کہ ہمارے ہم وطنوں نے ہمارے ان جذبات کی قدر نہیں کی مگر اب تو لگتا ہے کہ ہمارے ہم وطنوں کے ایک طبقہ نے اپنی قسمت کی کالک اپنے اس دھرم کے منہ پر پھیر دی ہے جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کی وسعت اور پہنائی میں سمندر بھی گم ہے، معارف میں کبھی ایک ایسے قانون کی حمایت کی گئی تھی کہ جس کی رو سے کسی بھی قوم و فرقہ کے بزرگوں کی توہین کرنے والوں پر قدغن لگ سکے لیکن آج کے حالات میں ایسے قوانین کی موجودگی بھی بس دکھاوے کی چیز معلوم ہوتی ہے، کمزوروں کے لیے حقوق بننے گھڑنے کی تاریخ کیسی ہی خوش کن ہو، اس کے نفاذ کی راہیں اکثر مایوس ہی کرتی رہیں، حقیقتاً معاملہ صرف جرم ضعیفی کا ہے، غم و غصہ کے اظہار کے ساتھ خود احتسابی اور اپنے اندرون میں پنپتی کمزوریوں کے جراثیم کو دیکھنا اور ان سے جسم کو پاک کرنے کے لیے قوت مدافعت پیدا کرنا ہی اصل علاج ہے، کورونا کے علاج کی یافت کے لیے آج دنیا جس درجہ سرگرم عمل ہے اس سے کہیں زیادہ بدنصیب قوموں کے ذہنی کورونا کے علاج کی ضرورت ہے،

خوش نصیبی سے یہ نسخہ کیمیا ابھی معدوم نہیں، پیغام کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ع

دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر بود

کاروان رفتگاں میں شامل ہونے والوں کا سلسلہ بھی رواں ہے، گذشتہ دنوں مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور ڈاکٹر محمد زاہد اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے، مولانا کی عمر درس و تدریس میں گزری، جامعۃ الفلاح کے تو وہ گویا بنیاد گزاروں میں تھے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا عالمانہ انکسار تھا جواب عموماً عنقا ہی ہے، ڈاکٹر محمد زاہد مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ان اساتذہ میں تھے جن کو رفقاو احباب و تلامذہ سب کی عزت و محبت حاصل تھی، ان حضرات کا غم تازہ تھا کہ اردو میں طنز و مزاح کے فن اور اس صنف لطیف کی آبرو جناب مجتبیٰ حسین بھی چل بسے، اردو ادب میں سنجیدہ طنز و مزاح کا دامن کچھ زیادہ مالا مال نہیں، مجتبیٰ صاحب کے عہد میں مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا، یوسف ناظم، نصرت ظہیر جیسوں کی حکمرانی رہی لیکن مجتبیٰ صاحب کی صاحب قرانی اپنی جگہ قائم و مستحکم رہی، بعضوں کو پڑھتے وقت پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی اور فکر تونسوی کی یاد آجاتی ہے لیکن مجتبیٰ صاحب کو پڑھتے ہوئے صرف ان کا سایہ ہی ساتھ رہتا ہے، جانے والوں کے قافلہ میں تازہ شریک جناب گلزار دہلوی ہیں، اسم اور مسمیٰ میں اتنی فطری مطابقت کم دیکھی جاتی ہے، کیا شخصیت تھی! سرتاپا شائستہ و نستعلیق، اردو تہذیب و ثقافت میں جیسا ظاہر ویسا باطن، اردو کی محبت اور قومی یکجہتی کی حفاظت میں تاعمر سینہ سپر رہے، دارالمصنّفین آئے، وہ سردیوں کی ایک صبح تھی، سبزہ زار پر چمکتی دھوپ میں ان کے وجود نے سارے ماحول کو حقیقتاً گلزار بنا دیا، وہ شاہ معین الدین اور سید صباح الدین کو یاد کرتے رہے، اشعار تھے کہ ہیرے موتی بکھر رہے تھے، آہ! اب یہ شکلیں نہ دکھائے گا زمانہ ہرگز۔

خوشی کی خبر یہ ہے کہ الحمدللہ معارف کے مدیر محترم جناب اشتیاق احمد ظلی رو بہ صحت ہیں، یقین ہے کہ قارئین معارف کو یہ خوش خبری عملی شکل میں آئندہ ان کے قلم سے نکلے شذرات کے ذریعہ بھی ملے گی، معارف والوں نے ان کی ناسازی طبع پر جس طرح فکر اور دعا دونوں کا اظہار کیا اس کے لیے شکریہ کا لفظ قطعی رسمی ہے۔

مقالات

مطلع النجوم و مجمع العلوم (نجم نسفی)

فارسی نثر و نظم کا ایک قدیم مأخذ

پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی

(۲)

نسفی کا فارسی کلام: نسفی نے مطلع میں اپنے مدوّن دیوان کے حوالے دیے ہیں۔مثلاً صنعت ملمع کے شواہد میں وہ لکھتے ہیں کہ ان کا ایک طویل قصیدہ اس صنعت میں ہے اور اس طرح کے اور قصاید بھی ان کے دیوان میں پائے جاتے ہیں (و ھی قصیدۃ طویلہ و لنا من جنسھا قصاید توجد فی دیوان شعرنا: 298b-299a)۔ہمیں نسفی کا عربی/ فارسی اشعار پر مشتمل مدوّن دیوان نہیں ملتا۔ان کے فارسی اشعار تو بالکل کمیاب ہیں۔مطلع سے ان کا کچھ نہ کچھ عربی اور فارسی کلام نکالا جا سکتا ہے۔ یہاں نسفی کے چند ایسے فارسی اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو یقیناً نسفی کے ہیں کیوں کہ ان اشعار کے ساتھ "قالنا"، "قال رضی اللہ عنہ بالفارسیۃ"، "قولنا فی ترجمتھا"، "لنا"، "قُلت فی ترجمتھا" کی وضاحت کی ہے۔عرشی صاحب نے بڑی کد و کاوش سے نسفی کے متفرق فارسی اشعار کو یکجا کیا ہے۔انھوں نے اس حصے میں ایسے اشعار بھی رکھے ہیں جن کے ساتھ شاعر کا نام درج نہیں ہے لیکن عرشی صاحب کا قیاس ہے کہ یہ بھی نسفی کے اپنے نظم کیے ہوئے ہیں۔اس گمان کی تصدیق اور تائید میں فی الوقت ہمارے پاس مزید کوئی دلائل نہیں ہیں۔

راقم السطور نے بھی مطلع سے نسفی کا فارسی کلام یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ وہ کلام ہے جو مصنف یا کاتب کی وضاحت کے مطابق خود نسفی کا ہے۔نسخۂ رام پور مغلوط اور ممسوخ ہونے کی وجہ سے عرشی صاحب کو قرائتِ اشعار میں بہت دشواری رہی۔جس کے نتیجے میں ان کے قلم سے ناقص اور

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

نادرست اشعار نقل ہوئے ہیں۔ میں اسے سوء ادب سمجھتا ہوں کہ اپنی قرأت کا عرشی صاحب کی قرائت کے ساتھ تقابل کروں۔ باذوق قارئین دونوں قرائتوں کا تقابل خود کر سکتے ہیں۔

حضرت ابوبکر کے ایک عربی شعر کا فارسی ترجمہ:

۱۔ قال نجم الدین رضی اللہ عنہ وعن والدیہ فی ترجمتہا:

گنہ کردم بنادانی گہی چند تو بردار ای خدای از بندہ این بند
چہ سازد چارہ ای بیچارہ بندہ بجُز فضل خداوند ای خداوند

(281b)

۲۔ قال نجم الدین رضی اللہ عنہ قلت فی ترجمتہا:

ای آنک فہم و وہم ہمہ خلق عاجز است از وصف اندکی ز فراوان نعیم تو
وای آنک عاصیان طمع عفو کردہ اند از حلم بی نہایت و فضل عمیم تو

(281b)

۳۔ من الصناعات الترصیع، قال رضی اللہ عنہ بالفارسیہ:

گرمی می ندہی بگوی ما را بازی گرمی نجویی، بگوی ما را بازی

(293a)

۴۔ صنعت تنسیق الصفات میں نسفی کے اشعار، وقولنا بالفارسیۃ:

ملکتی بی منتہی ایزد تعالی جدّہ پادشاہ شرق را دادست در فصل شباب
آن شہ شہ زادۂ لشکر کشِ لشکر شکن ملک دارِ ملک رانِ کام جویِ کام یاب
الب قتلغ ارسلان بَلکا ابوالفتح ابن خضر شاہِ عالی رایِ عالی رایتِ عالی رکاب

(297b)

۵۔ نسفی کا اپنے ہی عربی اشعار کا فارسی ترجمہ، "قولنا فی ترجمتہا":

از بخت بوَد چیز و سعادت، نہ ز حیلہ آن را کہ سعادت بوَد، حال نباشد
بس مال گِرَندہ کہ ورا حیلہ نباشد بس حیلہ کنندہ کہ ورا مال نباشد

(303a)

یہاں شاعر نے وزن کو ملحوظ رکھتے ہوئے "گیرندہ" کی جگہ گِرَندہ استعمال کیا ہے۔

عربی:

رَوح رُوح الموحدین وتفریج کربھم فی ملاقات صحبھم و مناجات ربھم

فارسی:

مر تن و حال اہل ایمان را در دو چیز ست راحت و آرام
در ملاقات اہل صدق و صفا در مناجات خالق علام
(298a)

۶۔لنا بالفارسیہ:

سمر شدیم بہ سہ چیز در جہان سہ تن مرین سخن را تفسیر بشنو و تفصیل
بہ بی وفایی یار و بہ بی قراری من بہ بی نظیری ابنِ خواجہ امام جلیل
(297a)

۷۔مثلہ لنا:

یقینم شد کہ سہ چیز ست کز سہ چیز در عالم نمی خواہد جدا شد ہیچ، بشنو شرح و تبیانش
رخ یارمن از وَردش، دل زارمن از دَردش کف میر اجل قاضی القضاۃ از جودواحسانش
(297a)

قولنا بالفارسیۃ:

من و تو ای نگار بی ہمتا ہیچو ماہیم در دو حال و دو گاہ
تو چو در نیم ماہ، ماہ تمام من چو نیمہ مَہَم بہ اوّل ماہ
تو بہ نورِ رخ و بہ صورت روی من بہ رخسار زرد و قد دوتاہ
(298b)

صنعت ملمع میں نسفی نے اپنے ایک قصیدہ سے مثال دی ہے جس کا ایک بیت عربی اور ایک بیت فارسی میں تھا، فارسی بیت یہ ہے:

جدا گشتم زدلبر تا جدا شد دل من از نشاط و شاد کامی
(298b)

نسفی کے اشعار سے صنعت توشیح کی مثالیں جس سے نام ظاہر ہوتا ہے، کقولنا:

عبداللہ:

عہد تو مجاز آمد و قول تو خلاف بد عہدی [و] در خوردِ جفا با اشراف
دل بُردہ ای و ہمی کنی استخفاف اللہ کہ من از تو نیابم انصاف
(302b)

نسفی کے کلام میں صنعت توشیح میں تضمین رباعی:

چہ قضا بود کہ ناگہان [کذا: ناگاہ] از آن روی چو ماہ زود مہجور شدم تا قد من گشت دوتاہ
ببریدم ز تو ای دلبر و از روی تو فرد ماندم و دور شدم وز تو گسستم ناگاہ
دل حسّاد حزین کردم ہنگام وصال قہر کردم ہمہ را تا شدشان عیش تباہ
ہمہ را کردم مقہور من آخر بہ فراق باز مقہور شدم بہ شود ان شاء اللہ
(302b)

اس صفحے کے حاشیے میں اس کی تبویب اس طرح کی گئی ہے:

چہ قضا بود کہ ناگہان [کذا: ناگاہ]	از آن روی چو ماہ	زود مہجور شدم	تا قد من گشت دوتاہ
ببریدم ز تو ای دلبر	واز روی تو فرد	ماندم و دور شدم	وز تو گسستم ناگاہ
دل حسّاد حزین کردم	ہنگام وصال	قہر کردم ہمہ را	تا شدشان عیش تباہ
ہمہ را کردم مقہور	من آخر بہ فراق	باز مقہور شدم	بِہ شود ان شا اللہ

و کقولنا بالفارسیۃ:

ہر کہ از دوست بہ جز دوست خوَہَد، دوست رہاند وآنکہ از دوست جدا ماند کرا داند خواند
ہمت دوست بہ دست آمدن از دوست بود چون ترا دوست شد از دست بہ دست تو چہ ماند
(302b)

یہاں ایک بات قابل توجہ ہے۔ پہلے مصراع میں ''خوَہَد'' آیا ہے جو ''خواہَد'' کا مخفف ہے۔ قدیم شعرا کے ہاں یہ تخفیف مستعمل تھی۔ لغت نامہ دہخدا میں ''خوہد'' کے ذیل میں سوزنی کا یہ شعر اسی تخفیف کے ساتھ بطور شاہد درج ہوا ہے:

کامم از جود او برونق شد ہم خوہد تا شود برونق تر

۸۔الالغاز یعنی معمیات کے صورت میں،قولنا بالفارسیہ فی اسم ''بکر'':

چہ گوید عرب میوہ را از نخست　　ازو ماخذ نام یار منست
وزآحاد وز عشرات و مئتین　　دوم حرف نام نگار منست
(303a)

۹۔وقولنا فی اسم ''علی'':

اگرمقدار مختاران موسی　　بگیری با دو میعادش بہ ترتیب
بدانی نام آن نام آور عصر　　کہ قول و فعل و خُلقش راست تہذیب
(303a)

''مختاران موسیٰ'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہاڑ پر دیدار خداوندی کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔جن کی تعداد ستر تھی۔ستر (۷۰) کا عدد حساب جمل میں حرف ''ع'' کے برابر ہے۔شاعر نے یہاں اپنے ممدوح (علی) کے نام کے پہلے حروف کے لیے ''مختاران موسیٰ'' سے استفادہ کیا ہے۔

۱۰۔وقولنا فی اسم ''طاھر'':

ز حروف جمل تو آن احاد　　آخر و اول و میانہ بگیر
باز چل چندِ آن میانہ بیار　　کو ز نام ویست حرف اخیر
(303a)

۱۱۔قولنا فی اسم ''الیاس'':

سلامت آمد وآرام ویُمن ولطف وامان　　ز عکس نام دلارام من دلیل و نشان
وگر زیادت ازین بایدت بیان بشنو　　کزین نکوتر شرح است مرورا و بیان
دو حرف اول [و] دو حرف آخر نامش　　دو حرف اول و دو حرف آخر قرآن
میانہ حرف میانگین آن سرِ سورہ　　کہ او میانہ و نیمہ ست از ہمہ فرقان
بہ نیمہ نام نخستنش وفا طمع کردم　　مرا بہ نیمۂ آخر فکند آن جانان
چوژی وی آمد و چون قلب نام او حالم　　دو حرف آخر آن حال را بدان بزفان
وگر فزایم بر آخرش میانگین حرف　　شوند نعمت و غم جملہ و کنند قِران

یکی نصیب تن من بوَد گہ وصلت یکی نصیب دل من بوَد گہ ہجران
(303a)

۱۲۔ صنعت متلون میں نسفی کا ایسا کلام جس کا ایک مصرع عربی میں اور دوسرا فارسی میں ہے۔ دونوں کے الفاظ بعینہ ایک جیسے ہیں، لیکن دو الگ زبانوں میں الگ الگ مفہوم ہے:

یا فتیً اَمنی وآسانی یافتی آمنی و آسانی
(303b)

۱۳۔ صنعت تصحیف حروف میں نسفی کا کلام، جس میں مصرعوں کو تصحیف کے ساتھ دو طرح سے پڑھا جا سکتا ہے کہ ایک عربی اور ایک فارسی بن جاتا ہے:

زار داری و دل من زارَد آری سیدی ذل من شیز؟ بناری؟
راز داری و دل زار داری ستدی دل من نیر نیاری؟
(303b)

مذکورہ اشعار میں دوسرے مصرع (عربی) اور اس کی تصحیف شدہ فارسی شکل پر مجھے اطمینان نہیں ہے۔ نسخے کا خط ایسا ہے کہ کوئی ماہر شاعر ہی اسے قیاسی طور پر درست پڑھ سکتا ہے۔

۱۴۔ صنعت ذات الوجوہ میں نسفی کا کلام جس میں مختلف اوزان اور قوافی میں اشعار پڑھے جا سکتے ہیں۔ نسخۂ تاشقند میں مندرجہ ذیل اشعار اسی رعایت سے مخصوص فاصلوں میں لکھے گئے ہیں، کقولنا:

مرا بی تو نیاید انس و راحت دل آراما دلم شد با جراحت
زخود ہرگز قراری می نیابم دلم بُردی بدان حُسنِ ملاحت
جدا نبوَم ز بیمت ہیچ وقتی ز درد تو نیابم استراحت
مکن شادان عدو را ماہ رویا نوانم من، مکن با من وقاحت
ترا ہر سو گر آید رای و ہمت نکو ناما، بکن با ما سماحت
شدم عاشق، دل وجان صید تو شد بہ دنیا در نیابم ہیچ راحت
جفا کردی بہ مِہرت بستہ گشتم بہ عشق تو کُنم بر خود نیاحت
مکن پویان کفو را مشک بویا دوانم من بدین درگاہ و ساحت
(303b)

اشعار نقل کرنے کے بعد ان کی تمام وجوہ (شکلیں) بتائی گئی ہیں کہ اشعار کو کس کس طرح سے پڑھا جا سکتا ہے:

الوجہ الاول (ابیات کے پہلے کلمات جمع کرنے سے جو پڑھا جاتا ہے): مرا ز خود جدا مکن، ترا شدم جفا مکن۔

الوجہ الثانی (نیچے سے اوپر پڑھنے سے): مکن جفا شدم ترا، مکن جدا ز خود مرا۔

الوجہ الثالث (پورے بیت کے جزء ثانی کے کلمات پڑھنے سے): بی تو ہرگز نبوَم شادان، ہر سو عاشق کردی پویان۔

الوجہ الرابع مثل الوجہ الثالث (نیچے سے اوپر کو پڑھا جائے) پویان کردی عاشق ہر سو، شادان نبوَم ہرگز بی تو۔

الوجہ الخامس: نیاید قراری ز بیمت عدورا، گر آید دل و جان بمہرت کفورا۔ (303b)

الوجہ السادس: کفورا بمہرت دل و جان گر آید، عدورا ز بیمت قراری نیاید۔

دیگر فارسی گو شعرا کا کلام:

مسعود سعد سلمان:

لمسعود بن سلمان فی الجمع بین اربعہ ایام و اربعہ عناصر و اربعہ اوراد و اربعہ اسلحہ فی بیتین علی التفصیل:

بنمود پریر آتش از گل خنجر　　دی نیلو فر فکند بر آب سپر

امروز زرہ بر سمن ای باد بدر　　وی خاک ز لالہ ساز فردا مغفر

(303b)

دیوان مسعود سعد سلمان کے دو ایرانی ایڈیشن دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر مہدی نوریان ایڈیشن میں یہ رباعی درج نہیں ہے۔ محمد مہیار ایڈیشن (پژوہشگاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، تہران، ۱۳۹۰ شمسی) اس میں یہ رباعی موجود ہے (ص ۷۰۹) لیکن ایک مختلف صورت میں۔ اس کے مرتب نے تعلیقات (ص ۹۰۱) میں لکھا ہے کہ خلیل شروانی نے نزہۃ المجالس میں اسے مسعود سے منسوب کیا ہے لیکن یہ رباعی رباعیات مہستی گنجوی (مطبوعہ باکو ص ۴۹) میں بھی ہے اور جاجرمی نے مونس الاحرار (ج ۲،

ص۱۱۶۹) میں اسے بلاذکر شاعر درج کیا ہے۔

برہانی:

وللبرهاني مثله:

بنمود پریر آتش از گل پیکان   نیلو فر از آب دی برآمد جوشان
امروز زباد یاسمین شد چوگان   فردا بکند خاک ز لاله خفتان
(303b)

زینتی ،عسجدی ،فرخی ،عنصری:

چار شاعروں کا مشترکہ کلام:

و اجتمع یوما العلوی الزینتی و العسجدی و الفرخی و العنصری۔

و قال الزینتی: مہ با رخ تو بہ نور پیشی نکند

فقال العسجدی: لعل با لب [تو] بہ رنگ بیشی نکند

و قال الفرخی: چون زلف تو تعبیہ نجاشی نکند

و قال العنصری: خوبی چہ کند کہ با تو خویشی نکند (303a)۔

مطلع میں شاعر کا نام زینتی ہی لکھا ہے،لباب الالباب میں بھی ایسا ہی ہے۔تاہم ترجمان البلاغہ کے ایک مخطوطہ مکتوبہ ۵۰۷ھ میں زینبی آیا ہے۔

عنصری:

قال العنصری بالفارسیة:

زمینی نہ ای، افتخار زمینی   زمانی نہ ای، اختیار زمانی
سپہری نہ ای، رہنمای سپہری   جہانی نہ ای، کدخدای جہانی
(300a)

عمارہ:

قال عمارہ بالفارسیة:

بنفشہ داد مرا آن بت بنفشہ قبای   بنفشہ بوی شد از بوی آن بنفشہ سرای
بنفشہ بوی ربود از دو زلف کوتہ او   بوَم چرا نبوَم جاودان بنفشہ ستای
(303a,302b)

عبدالصمد:

صنعت تلفیق میں، کقول عبدالصمد فی الفارسیۃ:

ای تو مشغول با پرستش جفت　　جفت با تو نکرد آنچ بگفت

گفت از تو نبرّم و ببرید　　باہمہ کار بر تو برآشفت

(303b)

نطنزی:

عرشی صاحب نے نظری نام شاعر کے فارسی اشعار لکھے ہیں (معارف، اپریل ۱۹۴۶ء ص ۲۶۷)۔ نسخۂ تاشقند میں یہ نام نظری نہیں بلکہ نطنزی [ن ط ن ز ی] لکھا ہے۔ کیا عجب کہ یہ بدیع الزمان نطنزی (وفات ۴۹۷ یا ۴۹۹ھ) مصنف دستور اللغۃ ہو جن کے بارے میں یہ بات بحوالہ سلم السموات مسلم الثبوت ہے کہ وہ ذولسانین (عربی، فارسی) شاعر تھے۔ نطنز، اصفہان کے نزدیک ایران کا شہر ہے اور شاعر یقیناً وہیں سے منسوب ہے۔

و منہا سیاقۃ الاعداد المختلفہ کقول النطنزی:

ہشت چیز سیّد سادات عالم بوالحسن　　دوستان و دشمنان را ہشت چیز آورد بار

بزم و رزمش، ورد و خار و عفو و خشمش، آب و نار　　امن و بیمش، تخت و داد و مہر و کینش، فخر و عار

(297b)

نامعلوم شعرا:

و قول آخر و الاعجمی:

ترا فضیلت بر خویشتن توانم دید　　اگر فضیلت نامردی و بی خطر یست

(302b)

لبعضہم بالفارسیۃ:

گفتم: نا وفا بہر جفا، گفتا: بہ　　گفتم: ار بہ وفا کنی، گفتا: بہ

گفتم: بکنی، زخم خوری، گفتا: دِ[ہ]　　گفتم: بزنم، چرا زنم، گفتا: زِ[ہ]

(303a)

عرشی صاحب نے ''دَری زبان کا ایک شعر'' عنوان کے تحت جو شعر درج کیا ہے جو خود ان سے بھی نہیں پڑھا گیا (معارف، اپریل ۱۹۴۶ء ص ۲۶۸)۔ نسخۂ تاشقند میں اس کے ساتھ دَری ہونے کی صراحت نہیں ہے بلکہ صنعت سوال و جواب کے ضمن میں ''لبعضہم علی النمط الاوّل'' لکھ کر نقل ہوا ہے۔ یہ شعر ترجمان البلاغہ (ص ۱۸۸) میں موجود ہے اور صاف فارسی میں ہے:

دل کو؟ بستد! بہ چی؟ بہ لب! کہ؟ پیروز! ناگاہ؟ بلی! کجا؟ بہ رہ! کی؟ ایمروز!

(303a)

اس شعر میں سوالیہ علامت کا مطلب کسی شعری مشکل سے نہیں ہے بلکہ ہم نے ترجمان البلاغہ کی پیروی میں سوال کے لیے علامت ؟ اور جواب کے لیے علامت ! ڈالی ہے۔

صنعت تفریق میں ایک ایرانی شاعر سے مثال:

اثر خشم [تو] از نوش پدید آرد نیش	سخن نغز تو از شیر فرود آرت شیر
از یکی دو نکند ہیچ کسی جز تو بہ تیغ	وز دو یکی ہیچ کسی جز تو بتر

(298a)

من و تو ہر دو از گل زردیم	چہ من از رنگم و تو از بویی
من ورا بویم ار ترا جویم	تو ورا بین اگر مرا جویی

(298a)

مذکورہ اشعار ترجمان البلاغہ کی ''فصل فی الجمع و التفریق'' (ص ۱۶۷) میں جزوی اختلاف کے ساتھ موجود ہیں:

تویی کہ جَور و بخیلی بہ تو گرفت نشیب	چنانک عدل و سخاوت بہ تو گرفت فراز

(299a)

عرشی صاحب نے مذکورہ شعر قیاس سے دوسری طرح لکھا ہے (معارف، اپریل ۱۹۴۶ء ص ۲۶۷)۔

صنعت تقطیع الحروف میں جو اشعار عرشی صاحب نے نقل کیے ہیں (معارف، اپریل ۱۹۴۶ء، ص ۲۶۷) وہ نہ صرف نسخۂ تاشقند سے قدرے مختلف ہیں بلکہ عرشی صاحب کے ہاں ایک بیت کی کمی

بھی ہے۔نسخۂ تاشقند میں یوں ہے:

ای دل ار آرزوی او داری | از درد آن دو رُخ مکن زاری
روی زرد و دو رُخ ، دو رُودِ روان | از روانِ دو رُود دل او آری
وزدل آرام و درد دو رخ او | رای او داری ار درِ داری

(301a)

مذکورہ اشعار ترجمان البلاغہ کی ”فصل فی المقطّع“(ص ۱۹۷) میں قدرے مختلف درج ہوئے ہیں:

ای دل از آرزوی وی زاری | زاری از درد آن دو رُخ زاری
روی زرد و دو رُخ ، دو رُودِ روان | از روان زاره ودل آزاری
ازدل آرام درد ِآن رخ او | رای وی داری از درِ داری

....

هر روز به دل رجا و خوفی دارم | آتشکده از قهر تو خوفی دارم
هر روز چو حجّاج حرم در عرفات | پیرامن درگاه تو طوفی دارم

(243a)

سلطانِ همه عالم، منصور و مظفر | افلاک مطیع است مرو را [و] مسخّر
بر عرش برد خطبه او نام بزرگش | بر چرخ نهد خاطب او پای به منبر
آبي که بدان شاه جهان دست بشوید | زان آب یکی قطره به از چشمهٔ کوثر
خاکی که بران خاک زمانی بنهد پای | یک ذرّه ازان خاک به از چرخ مدوّر
روزی که سخن تیغ بود تیر اشارت | چون حمله برد پیش صف آن خسرو صفدر
چه حصن و چه کوه آید و چی دشت و چه دریا | چه بادو چی خاک آید [و] چه آب [و] چه آذر
از هیبت او آب هلاک آید و طوفان | وزحملهٔ او باد سموم آید وصر صر
جاوید بقا باد ورا در شرف و عزّ | در ملک وبزرگی و دول بر سرش افسر

(264b)

ای صدر همه عالم و قطب همه اقطار — ای کنف بنی آدم و غوث همه احرار

ای روز پُر از شادی و ای ماه پُر نور — وی بحر پُر از گوهر، وای ابر پُر از بار

گویند همه عالم را چارست به اخلاق — اخلاق تو از لطف دهد مایه به هر چار

آب از تو برَد پاکی و باد از تو برَد بوی — خاک از تو برَد نعمت و نور از تو برَد نار

عید همه اعیادی ، شاه همه اجنادی — ذکر همه را جانی، نور همه انوار

تا دهر همی باشد تو نیز همی باشی — دررفعت[و]درحشمت واعدای تو بردار

(265a)

تا بآیین ترا رجا وحیات — عقل را اصل ومردی را ذات

هرچه اندر جهان همه خوب است — صف زده گردت ای ستوده صفات

خدمتش کن به دل که خدمت اوست — منشاء فخر و منبع برکات

رب تعالی بقا دهاد ورا — تا جهان را بوَد بقا و ثبات

(265b)

ای سخن های تواندر کتب علم نگین — ای هنر های تو بر جامۀ فرهنگ طراز

راست گویی ز خدای آمدنزدیک به وحی — که به جهداین نتوان یافت به ایام دراز

(266b)

نسفی نے فصول المشاھدلحصول المقاصد کی فصل فی المذکرعلی الاعتذار میں ایک حکایت اور اس کے ضمن میں ایک قصیدے کے آٹھ اشعار، شاعر کا نام لیے بغیر درج کیے ہیں۔ یہ اشعار منوچہری کے قصیدے سے لیے گئے ہیں۔(۸) چونکہ مطلع میں درج اشعار کا مطبوعہ قصیدے سے شدید اختلاف ہے، یہ قدیم روایت بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے:

پیروز بخت، مهتر و کهتر نوازِ نیک — مخدوم اهل عالم و سالار هر که حیّ

فرخ تنی که بر سرش از برج آفتاب — چترست هر دو پای همای خجسته پی

هنگام رای روشن و هنگام جود او — شیٔ هست هیچولاشیٔ، لاشیٔ بوَد چوشیٔ

دور از فجور فسق و برَی از ریا و روی — شُسته ز زرق وتنبل ورَسته ز بخل و نیَ

با نظم ابن رومی و با نثر اصمعی — با خط ابن مقله و با دانش اُبَیّ
با باد لطف او نگراید سموم تیر — با ابر او ضرر نکند زمہریر دَی
با اصلِ مردمِ علوی باشد از علی — با اصل احمد قُرشی باشد از قُصیّ
ہموارہ باش مہتر و ہموارہ باش صدر — ہموارہ باش تازہ و ہموارہ باش حیّ

(267b)

آخر کلام: پانچویں، چھٹی صدی ہجری سے ماقبل فارسی گوشعرا کے جواشعار اور دواوین دستیاب ہیں اور بعض ایران یا دیگر ممالک میں شائع ہو چکے ہیں اور کچھ ہنوز زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئے، ایسے اشعار کی کسی تدوین اور اشاعت کے وقت مطلع کو سامنے رکھنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس میں ان اشعار کی وہ روایت محفوظ ہوئی ہے جو نجم الدین نسفی کو پانچویں یا چھٹی صدی ہجری کے اوائل تک دستیاب تھی، منوچہری کے قصیدے کے مثال ہم اوپر دے چکے ہیں کہ اس کی مطبوعہ صورت، مطلع میں درج اشعار سے کس قدر مختلف ہے۔

حواشی

(۱) Bulgakov P.G. Neizvestniy entsiklopdicheskiy trud XII veka//Obshestvenniye nauki v Uzbekistane, Tashkent, 1946, No.11, PP57-61.

مطلع النجوم و مجمع العلوم نام سے ملتے جلتے نام کی ایک کتاب، مطلع زواہر النجوم و مجمع جواہر العلوم مجد الدین ابی طاہر محمد بن سراج الدین ابی یوسف یعقوب بن محمد فیروز آبادی (۷۲۹۔۸۱۶ھ) کی تصنیف ہے۔ (۲) ارشاد، مرکز پژوہشی میراث مکتوب، تہران، ۲۰۰۶ء، صفحہ شصت و پنج۔ (۳) دیکھیے: Muhammadamnivo,S. "Matla'al-Nujum Wa Majma'al-Ulum by Abu Hafs, Umar Al-Nasafi, As A Sample of Guidence Manual at the time of Qarakhanids" Manuscripta Orientalia, St. Petersburg. Vol. 21, No.2, December 2015, PP. 20-31

(۴) مطبوعہ مجلہ آیندہ، تہران ۱۳۶۲ شمسی، جلد ۹، شمارہ ۳۔۴، ص ۲۶۶۔۲۶۸۔ (۵) مطلع النجوم، طبع تاشقند، ۲۰۱۵ء، حاشیہ ۱۲۴، صفحہ XXXIX۔ (۶) ایضاً، ص XL۔ (۷) نجم نسفی کا فارسی ترجمۂ قرآن مجید، تفسیر نسفی نام سے ایران میں بہ اہتمام عزیز اللہ جوینی شائع ہو چکا ہے۔ عقائد نسفی، حنفی عقائد پر بہت مقبول فارسی کتاب ہے

اور کئی بار چھپ چکی ہے۔ایک بار ”بیان اعتقاد اہل سنت و جماعت“ عنوان سے بکوشش محمد خوانساری و آلبرت ناپلیئون کمپانیونی، مجلہ فرہنگ ایران زمین، تہران، شمارہ ۴، سال ۱۳۳۵شمسی، ص ۱۵۹-۱۷۲ میں چھپی ہے۔نسفی کے رسالہ تصوّف و اہل تصوّف کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، (نمبر ۲۲۳ فارسیہ مذہب و تصوف) میں ہے۔(۸) دیوان منوچہری دامغانی، بہ تصحیح سید محمد دبیر سیاقی، انتشارات زوار، تہران، چاپ ہفتم، ۱۳۹۰شمسی، ص ۱۳۴-۱۳۵۔

فہرست محتویات مطلع النجوم و مجمع العلوم تالیف نجم نسفی

مطابق مخطوطات تاشقند و رامپور

عدد مسلسل	عنوان	صحیفة نسخه طبع طشقند رقم ۱٤٦۲	صحیفة نسخة رامفور رقم ۵۳۸۰
۱	مقدمة	1b	مفقود
۲	تسمية مضمناته بالقابها	1b - 2b	مفقود
۳	اصول الدين على اعتقاد المهتدين	2b - 3b	مفقود
٤	تعداد الخصال التى جعلها النبى عليه السلام من شعب والايمان والاسلام	3b - 4a	مفقود
۵	تسمية الشيخ من اهل الهواء والبدع	4a - 5b	مفقود
٦	ترتيب المنازل المحققين من اهل المعرفة و تعريف كل صنف منهم بما تختص من الصفة	5a - 6b	مفقود
۷	منثور الخطاب فى مشهور الابواب	6b - 9b	مفقود
۸	حديث فى حقوق المسلم على السلم	9b - 10a	مفقود
۹	كتاب الحقوق الخمسين	10a - 12a	مفقود
۱۰	مختصر البيان والفحص عن قراءة عاصم بروايته حفص	12a - 14b	مفقود
۱۱	اصول الوقوف على مواضع الوقوف	15a - 17b	۱ - ۸

۱۲	کتاب البیان عن غریب القرآن	17b - 35b	۱ ۔ ۵۵
۱۳	کتاب تحصیل اصول الفقہ و تفصیل المقالات فیہا علی الوجہ	36a - 44a	۵۵ ۔ ۷۹
۱٤	کتاب مشارع الشرایع	44b-162a	۷۰ ۔ ٤۵۱
۱۵	کتاب المذاکرۃ و الامتحان فی المسایل الاحسان	163b-169a	٤۵٤ ۔ ٤۷٤
۱٦	نظم کتاب الفرایض (ابو منصور محمد بن علی المہلّبی الکاتب ایام السمانیۃ)	169a-170b	٤۷۵ ۔ ٤۷۹
۱۷	مسایل المعایاۃ فی الفرایض لأبی نجاء محمد بن مطہر بن عبید الفارص	170b-171b	٤۷۹ ۔ ٤۸۳
۱۸	مسایل من حُبُسِہا نظمہا علی بن محمد النسوی	171b-173a	٤۷۳ ۔ ٤۸۸
۱۹	کتاب التحاریر المختارۃ فی الخلافات الدوّارۃ	173a-179a	٤۸۹ ۔ ۵۰۸
۲۰	کتاب عدّ المسایل الحسان التی اخذ فیہا اصحابنا بالقیاس دون الاستحسان	179b-179b	۵۰۹ ۔ ۵۱۱
۲۱	کتاب الملاحن	179b-181a	۵۱۱ ۔ ۵۱۵
۲۲	التواریخ و الانساب (من تواریخ الانبیاء و الامم السالفۃ النبی محمد (ص) و زوجاتہ و اولادہ موالیہ، خلفاء الراشدین الی آخرہ	181a-183a	مفقود
۲۳	تسمیۃ اصحابہ المکرمۃ علی ترتیب الحروف المعجمۃ	183b-196a	مفقود
۲٤	باب ذکر النساء تقدّم ذکر زوجات النبی (ص) و باب المعروفات منہن بالکنی	196a-198b	مفقود
۲۵	تاریخ الخلفاء القایمین بعد الخلفاء الراشدین	198b-199b	مفقود
۲٦	نسبۃ مشاہیر ایمۃ الدین و تواریخہم	199b-200a	مفقود

۲۷	السبعیات السمعیات (۳۶۰ الاحادیث الصحیحہ) علی عدد ایام تمام السنة	200a-216a	۵۱۷ - ۵۶۵
۲۸	کتاب الخطب الجیاد للجمع والاعیاد	216a-227a	۵۶۶ - ۶۰۶
۲۹	تذکرۃ اصول التذکیر وتبصرۃ وجوہ التقدیر	227a-251a	۶۰۷ - ۶۹۶
۳۰	کتاب مختصر الصکوک علی النہج المسلوک فی الشراء	251a-256b	۶۹۷ - ۷۱۶
۳۱	ملتقطات من الرسوم للقضاۃ والخصوم	256b-260a	۷۱۷ - ۷۳۱
۳۲	الفصول الخمسون فی رسوم الکتابۃ وابواب البلاغۃ	260a-264a	۷۳۱ - ۷۴۵
۳۳	فصول المشاھد لحصول المقاصد	264a-268b	۷۴۶ - ۷۶۲
۳۴	کتاب مادبۃ الادیب ومأربۃ الاریب	268b-271a	۷۶۲ - ۷۷۲
۳۵	حصر المؤنثات السماعیۃ فی ابیات للنطنزی صناعۃ	271a-271b	۷۷۲ - ۷۷۳
۳۶	جمع وجوہ الجمع	271b-272a	۷۷۳ - ۷۷۴
۳۷	ترصیف فصول التصریف	272a-274a	۷۷۴ - ۷۸۳
۳۸	فصل فی الصلات ومالھا من الوجوہ و الصفات	274a-276a	۷۸۳ - ۷۸۹
۳۹	مراتب الحروف	276a-276b	۷۸۹ - ۷۹۰
۴۰	بدو النحو	276b-277b	۷۹۰ - ۷۹۵
۴۱	الجوامع اللوامع منھا الکنی المسموعہ الاشیا مجموعہ	277b-280a	۷۹۵ - ۸۰۳
۴۲	کتاب الاشعار بقدر الاشعار وما جاء عن ایمۃ المتاخرین	280a-292a	۸۰۴ - ۸۴۵
۴۳	القصیدۃ محاسبۃ لنا اوایلھا الحروف المعجمۃ قافیتھا الطاء	292a-292b	۸۴۵ - ۸۴۷

۴۴	کتاب الصناعات والابداعات	293a-304a	۸۷۴ - ۸۸۶
۴۵	مختصر العروض علی الاصول معروض	304a-309b	۸۸۶ - ۹۰۶
۴۶	کتاب الامثال المحکمة علی الحروف المعجمة	310a-315b	۹۰۷ - ۹۲۵
۴۷	قصیدة للباذنی یجمع امثال العجم	315b-316a	۹۲۵ - ۹۲۷
۴۸	کتاب الجابر العابر مقدمة جامعة	316a-321b	۹۲۷ - ۹۴۷
۴۹	کتاب ایراد الاوراد	321b-325b	۹۴۷ - ۹۶۰
۵۰	مدخل فی علم التجنیم ومعرفة التقویم	325b-330a	۹۶۱ - ۹۷۶
۵۱	مختصر الضرب والقسمة ومعرفة التشابه بین الاعداد ومخارج الکسور والنسبة	330a-335b	۹۷۷ - ۹۹۵
۵۲	کتاب استخراج الخبیّ بالحساب السوی	335b-340a	مفقود
۵۳	کتاب هدیة الحب فی علم الطب	340a-341a	۹۹۵ - ۹۹۸ ناقص الآخر
۵۴	کتاب منافع الاغذیة ومضارّها وباردها وحادها	341a-344a	مفقود
۵۵	دلالات الایام علی بدایات الاسقام	344a-344b	مفقود
۵۶	مداخل السنة فی اول یوم من المحرم	344b	مفقود
۵۷	نتف من طبائع الحیوان	344b-345b	مفقود
۵۸	کتاب الابتهاج لمعرفة اثر الاختلاج	345b-346b	مفقود
۵۹	کتاب الفراسة فی میدان العراسة	346b-350a	مفقود
۶۰	کتاب العلامات للخیلان والشامات	350a-351b	مفقود
۶۱	کتاب استخراج الحال الافین والخصمین بمحاسبه حروف الاسمین	351b-352a	مفقود
۶۲	کتاب الفال الفایق عن جعفر بن محمد الصادق	352a-355a	۹۹۹ - ۱۰۰۷
۶۳	خاتمة الکتاب وفراغ الکتابة	355a-355b	۱۰۰۷

اقبال کے شعری تکرار

پروفیسر عبدالحق

حسن تکرار شعری فن ہے مگر تکرار بے جا کو معیوب مانا گیا ہے۔ موزوں اور خوش آواز لفظوں کے تکرار سے شعری آہنگ میں نغمگی پیدا ہوتی ہے، اگر ایسا نہ ہو تو طبیعت پر تکدر طاری ہوتا ہے، چاہے ولی کی غزل ہو یا جوش کی نظم، موزوں ترتیب اور غنائیت شعری امتیاز ہے۔

اقبال کی فارسی شاعری میں کئی جگہ اشعار کا اعادہ گراں گزرتا ہے، ان کی کیا مصلحت یا مجبوری تھی کہ انہوں نے کئی جگہ اشعار کو دوبارہ استعمال کیا ہے، یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں افکار کا ایک بے اماں سیل ہے، ان کا فن ان کی فکر کے تابع ہے، ماضی میں قلمبند کیے گئے افکار کے حامل اشعار کو موقع کی مناسبت سے وہ نئی تخلیق میں استعمال کر لیتے ہیں یہ فکر کی روانی میں معاون ہوتے ہیں اور اظہار کو مزید مؤثر بنا دیتے ہیں، ان کے علاوہ دوسرے نکات پر بھی ان کی نظر ہوگی، مگر ایک عام قاری کی حیثیت سے راقم کو یہ بات کھٹکتی ہے، انہیں بلا کی قوتِ تخلیق حاصل تھی وہ کمالِ فن کے بڑے رمز شناس تھے، شاید انہیں اپنے افکار کی تائید یا ترجمانی میں پرانی تخلیق کی باز آفرینی سے کوئی عار نہ تھا بغیر کسی تامل کے دوسری تخلیق میں مستعمل یا نظم کیے گئے اشعار کو نئی تخلیق میں شامل کرنے کی کئی مثالیں موجود ہیں، شاید فکری سلسلے کو مربوط کرنے میں انہیں مدد ملی ہو، یا اسی خیال کو دوبارہ نظم کرنے کی جگہ اس فکر کے حامل اشعار کو جزوِ تخلیق بنا لینے کو بہتر سمجھا ہو، اقبال کا گراں مایہ ذخیرہ اپنی کثرت اور ضخامت کے اعتبار سے عہد جدید کا تخلیقی معجزہ ہے، عالمی ادب میں بھی کئی صدیوں میں کسی ایک فن کار کا یہ ذخیرۂ ادب نظر نہیں آتا، اس ضخامت کے سبب بھی اشعار کا دوبارہ در آنا فطری لگتا ہے، جو بھی سبب ہو تکرار خطابت کا ہو یا تحریر اور طرزِ زندگی کا محبوب نہیں سمجھا جاتا، انسانی ذوق ہر لمحہ ایک نئے جلوہ کو روبرو دیکھنے کا عادی ہے،

ہڈسن لائن کنگس وے کیمپ، دہلی۔

اقبال بھی جہانِ تازہ اورافکار تازہ کے قائل ہیں۔

جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہوا بھی ہونو خیز، ہرلحظہ شان وجود کی تازگی اور دمادم صدائے کن فیکون، فکرِ اقبال میں معتبر مقام کے حامل ہیں، فارسی، اردو اور باقیات کے کلیات کے صفحات کی مجموعی تعداد تقریباً ۲۲۲۰ ہے، شعری تکرار کونشان زد کرنا آسان بھی نہیں، تمام اشعار یا مضامین کا حافظے میں ذہن نشین رکھنا امر محال بھی ہے، راقم نے چند اشعار کو نشان زد کیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی اشعار تکرار کے حامل ہیں۔

فکر وفن کے اعتبار سے اقبال کی فارسی شاعری زیادہ وقیع اور حسین ہے، یہ دوسری بات ہے کہ انہیں سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت اردو شاعری کی بدولت حاصل ہوئی، یہ دلچسپ بات ہے کہ تکرار کی تقریباً تمام صورتیں فارسی میں ہی ہیں، اردو میں نہ یہ کیفیت ہے اور نہ کثرت، اردو شاعری میں لفظوں کے تکرار ہیں جو فنی محاسن کے مظاہر کی حیثیت رکھتے ہیں، بالِ جبریل کی بے مثال غزل کے یہ تکرار: اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن یا مسجد قرطبہ کے پہلے بند میں سلسلۂ روز وشب کا تکرار بہت ہی معنی آفریں اور نادر مثال ہے۔

اقبال کی فارسی شاعری کا آغاز اسرارِ خودی سے ہوتا ہے، اس کا حرفِ اول مولانا رومی کے تین اشعار ہیں جو سرنامہ کے طور پر درج کیے گئے ہیں:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

یہ اشعار اقبال کو بہت پسند آئے، کیوں کہ یہ ان کے بنیادی خیال کے ترجمان ہیں، حالانکہ اسرار سے پہلے اقبال انسان کی تلاش میں نکل چکے تھے، انہیں انسانی فضیلت کا عرفان ہو چکا تھا، اس انسان کی جستجو میں اقبال نے وہ بات بھی کہہ دی جو رومی نہ کہہ سکے تھے۔

خدا ہم در تلاش آدمے ہست

پھر بھی اقبال کی نیاز مندی باقی رہی، اس عجز وانکسار سے اقبال کی مفکرانہ شخصیت بھی مجروح ہوتی ہے، رومی واقبال کے نظریات کہیں کہیں متصادم ہوتے ہیں، مگر مرید ہندی کی عقیدت کو کیا کہیے کہ وہ اپنے افکار کو مولانا رومی کے حوالے کر کے بے نیاز ہو جاتے ہیں فکر وفلسفہ کی تاریخ میں یہ کسی اعجوبہ سے کم نہیں ہے، رومی کے ان اشعار کی پسندیدگی دیکھیے کہ اقبال نے جاوید نامہ کے شروع میں تمہید زمینی کے بعد غزل کے تینوں اشعار دوبارہ نقل کیے ہیں پہلے شعر کا حوالہ دیا جا چکا ہے دوسرا اور تیسرا شعر

نقل کیا جارہا ہے یہ غزل کے آخری اشعار ہیں:

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت   شیر خدا و رستم و دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما   گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

نواشعار پر مشتمل یہ پوری غزل رومی کی ہے جو واوین کے ساتھ نقل کی گئی ہے، فنی اعتبار سے یہ پیوند کاری موزوں نہیں کہی جاسکتی، یقین ہے کہ اقبال کے پاس اس تکرار کا معقول جواب ہوگا، تمہید آسمانی کے بعد تمہید زمینی کا جو منظر نامہ پیش کیا گیا ہے اس کے بعد غزل سرائی کا حسین جواز پیدا ہوتا ہے:

تشنہ و دور از کنارِ چشمہ سار   می سرودم ایں غزل بے اختیار

اقبال نے اس غزل سے وابستگی کا حرفِ راز بتادیا ہے، شاید یہی تکرار کا سبب ہو، پیام مشرق کی ایک غزل رومی کی یاد تازہ کرتی ہے، رومی کے علاوہ نظیری نیشاپوری اقبال کے دوسرے ممدوح ہیں ڈائری میں اندراج کے ساتھ نظیری کی زمین میں اقبال نے کئی غزلیں نظم کی ہیں، اقبال نے نظیری کو جو خراج نذر کیا ہے وہ رومی کو بھی نہ پیش کرسکے، اسرارِ خودی کا حرف بسم اللہ نظیری کا شعر ہے، خراج عقیدت کے جس شعر کا ذکر کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

بملک جم ندہم مصرعِ نظیری را   کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ مانیست

نظیری کے اس مصرع پر اقبال ملک جم کی سلطنت کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہیں، غالب نے مومن کے شعر پر دیوان کو نذر کرنے کی بات کہی تھی، اقبال ایک مصرع پر متاعِ گراں بہا کو نثار کرنے کے لیے آمادہ ہیں، پیامِ مشرق کی جس غزل کا یہ شعر ہے اس میں دس اشعار ہیں، جاوید نامہ میں فلکِ مریخ پر نوائے حلاج کے عنوان کے تحت اس غزل کے آٹھ اشعار دوبارہ نقل کیے گئے ہیں، جس میں نظیری کے مصرع کی تکرار بھی شامل ہے، پیامِ مشرق کی غزل ۱۹۲۱ء کے آس پاس تخلیق کی گئی جاوید نامہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا، گویا دس سال قبل لکھی جانے والی غزل کو شامل کرنے میں اقبال کو قباحت نہ ہوئی، جو بھی ہوا تکرار ہی کہیں گے، غالباً نظیری کے مصرع کی ابدی حقیقت کے اعتراف کے لیے ہی زمینِ نظیری میں یہ غزل کہی گئی، نظیری کے نظریۂ شوقِ شہادت سے بہتر اقبال کے نزدیک کوئی دوسرا قول نہیں ہوسکتا، اقبال کا اعتراف خود ان کے تصورات کی حکیمانہ تصدیق ہے۔

کئی اشعار کے دوبارہ استعمال کی ایک اور صورت بڑی دلچسپ ہے، گلشن راز میں ایک اور

نظم ''مذہب غلاماں'' بھی ہے اس میں ۱۳۹/اشعار ہیں، اس نظم کے چھ اشعار مثنوی مسافر میں تسلسل کے ساتھ ''خطاب بہ اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ'' میں شامل ہیں، وہ اشعار حسبِ ذیل ہیں:

مردن و ہم زیستن اے نکتہ رس — ایں ہمہ از اعتبار است و بس

مرد کرسوز نوا را مردۂ — لذتِ صوت و صدا را مردۂ

پیش چنگے مست و مسرور است کور — پیش رنگے زندہ در گور است کور

روح باحق زندہ و پایندہ است — ورنہ ایں را مردہ آں را زندہ است

آں کہ حیٌ لایموت آمد حق است — زیستن باحق حیاتِ مطلق است

ہر کہ بے حق زیست جز مردار نیست — گرچہ کس در ماتمِ اوزار نیست

کئی سال قبل کہے گئے اشعار ۱۹۳۶ء کی تخلیق کا حصہ بن گئے، یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں، ان اشعار کو داوین میں نقل کیا گیا ہے، اور نقل سے پہلے اقبال نے حوالہ بھی دیا ہے کہ:

حق نصیبِ تو کند ذوقِ حضور — باز گویم آنچہ گفتم در زبور

گویا اقبال نے اقرار کیا ہے کہ یہ اشعار زبور عجم سے پیش کیے جارہے ہیں، ناچیز نے کلیات فارسی کو بارہا پڑھا ہے، مگر کبھی اس پر نظر نہ ٹھہری، زبور میں غزلوں کے بعد کئی نظمیں شامل ہیں، 'مذہب غلاماں' کے یہ اشعار اقبال کے حوالے سے داوین میں درج کیے گئے ہیں، یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کلام میں اقبال نے دوبار زبورِ عجم کا حوالہ دیا ہے، اس حوالے کے علاوہ دوسرا حوالہ اردو میں موجود ہے، کسی اور مجموعہ کو پڑھنے کی یہ تاکید نہیں ملتی۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم — فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

تکرار کی یہ بڑی مثالیں ہیں جن میں کئی اشعار شامل ہیں، ان کے علاوہ متفرق اشعار کا اعادہ بھی فارسی کلام میں کہیں کہیں نظر آتا ہے جیسے اسرارِ خودی میں مقصدِ حیات مسلم کے ذیل میں یہ شعر درج ہے:

درقبائے خسروی اندیش زی — دیدۂ بیدار وخدا اندیش زی

یہی شعر پیام مشرق میں اعلیٰ حضرت امیر اللہ خاں فرماں روائے افغانستان کے پیشکش میں بھی موجود ہے، اقبال نے اکرامِ آدم پر بہت تاکید کی ہے، انسانی احترام وفضیلت ان کی فکر کا سب سے اہم عنصر ہے، جاوید نامہ میں ''خطاب بہ جاوید'' میں اقبال کا مشہور شعر وارد ہے:

آدمیت احترام آدمی باخبر شو از مقام آدمی

یہی شعر ارمغان حجاز میں ''حضورِ عالم انسانی'' کے ذیل میں سرخی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جس سے اقبال کے بیکراں تصور کی ترجمانی ہورہی ہے، ظاہر ہے کہ اقبال کو یہ شعر بہت عزیز ہے، کیونکہ یہ ان کی بنیادی فکر کی روح ہے، ''پس چہ باید کرد'' میں حوالے کی ایک دوسری صورت سے سابقہ ہوتا ہے جو تکرار تو نہیں ہے، مگر مولانا رومی کی پیروی کا بہت مناسب فنی طریقۂ کار نہیں ہے، مثنوی مسافر میں نادر شاہ افغان کے ذکر سے نظم کا آغاز ہوتا ہے، چودہ اشعار کے بعد مولانا روم کے پانچ اشعار تواتر کے ساتھ واوین میں درج کیے گئے ہیں، نظم میں کل تیس اشعار ہیں جن میں پانچ مولانا رومی کے ہیں، ایک صفحہ بعد پھر مولانا رومی کے چار اشعار ''خطاب بہ اقوام سرحد'' میں شامل ہیں، کسی بھی تخلیق میں دوسروں کی تخلیق کے حوالوں کی یہ کثرت غیر مناسب معلوم ہوتی ہے، یہ صرف اقبال کی پسند وناپسند کی بات ہے، راقم کے خیال میں یہ اقبال جیسے عظیم فن کار کے شایانِ شان نہیں لگتا، اقبال نے تضمین کی نئی طرح ڈالی اور بزرگوں کی روایت سے فائدہ اٹھایا ہے، وہ بہ سہولت یہاں بھی تضمین سے کام لے سکتے تھے، متاثر ہونے کا جواز ہے مگر مرعوب یا مغلوب ہونے کا نہیں۔

جاوید نامہ اقبال کی شاہ کار تخلیق ہے، موضوعات اور ان کے پیشکش کی کثرت آرائی نے اسے درحقیقت زندگیٔ جاوداں بخش دی ہے، اقبال کے افکار کی ارتفاعیت بام گردوں کی بلندیوں کو آواز دیتی ہے، دوسری طرف ان کی تخلیقات سے استفادہ یا استصواب حاصل کرنے کی مثال کے لیے بھی یہ دوسرے مجموعوں سے ممتاز ہے، اب تک کئی غزلوں کے حوالے زیر بحث آئے ہیں چار شعر کی ایک دوسری غزل بھی من وعن نقل کردی گئی ہے، جاوید نامہ کے ابتدائی صفحات میں 'نغمۂ ملائک' کے عنوان سے سابقہ ہوتا ہے اس میں چار اشعار ہیں، یہ سبھی اشعار ''زبور عجم'' کی غزل سے مستعار لیے گئے ہیں، غزل ملاحظہ ہو:

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے زمیں از کوکبِ تقدیر ما گردوں شود روزے

خیال ما کہ اورا پرورش دادند طوفانہا زگردابِ سپہر نیلگوں بیروں شود روزے

یکی در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

اس تکرار بے جا کی مناسبت یا مدافعت اقبال ہی کر سکتے ہیں، ’’زبورِ عجم‘‘ پڑھنے کی تاکید میں شاید اس اعادے کا راز پنہاں ہو، مولانا روم کے اشعار کے تکرار کی صورتیں بھی مختلف ہیں اسرارِ خودی میں بابا پائے صحرائی کے عنوان میں یہ شعر موجود ہے:

اے کہ باشی درپئے کسبِ علوم　　با تو میگویم پیام پیرِ روم

علم را برتن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود

دوسرا شعر اردو میں تکرار کے طور پر وارد ہے ’بال جبریل‘ کی مشہور نظم پیر و مرید ہے، اس نظم کا دوسرا شعر مذکورہ بالا آخری شعر ہے، علم را برتن زنی اس طرح فارسی کلام کے علاوہ اردو کلام میں بھی فارسی اشعار کے تکرار کی مثال موجود ہے جو اردو شعر کے تکرار سے الگ ہے، دو مختلف زبانوں میں تخلیق پانے والے ادب میں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

مولانا کا ایک دوسرا شعر جاوید نامہ کے شروع میں غزل کے بعد درج ہے، وہی شعر اردو نظم ’’پیر و مرید‘‘ میں بھی موجود ہے:

آدمی دید ست باقی پوست است　　دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

حافظ شیرازی کی گوسفندی سے بیزاری کے باوجود اقبال نے ان کا حسب ذیل شعر بانگِ درا اور بال جبریل میں مکرر نظم کیا ہے، حصہ سوم کی نظم نصیحت کی نظم نپولین کے مزار پر:

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است　　حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

(دیوانِ حافظ دہلی ۱۹۷۲ء)

’’جاوید نامہ‘‘ میں فلکِ زہرہ پر فرعون اور کشنر کی روح کے ذیل میں غزل کے عنوان سے پانچ اشعار رومی کے نقل کیے گئے ہیں، اقبال کہتے ہیں کہ یہ غزل عالمِ مستی میں پڑھی، رومی کی غزل کا مطلع ہے:

باز برفتہ و آیندہ نظر باید کرد　　ہلہ برخیز کہ اندیشہ دگر باید کرد

رومی کے پانچ اشعار کا اقتباس اقبال کی مربوط تخلیق کے لیے مناسب نہیں یہ ان کی بے جا عقیدت کا مظہر ہے، جو اقبال جیسے عظیم فن کار کو زیب نہیں دیتا، تخلیق کی جامعیت پر بھی فرق پڑتا ہے، کثرتِ حوالہ ہر تحریر کے لیے مستحسن عمل نہیں ہے۔

’’جاوید نامہ‘‘ میں شعری تکرار کی ایک اور مثال ہے جس میں پوری غزل کا اقتباس موجود ہے،

آسمانی سفر کی پہلی منزل فلک قمر ہے یہاں مختلف مذاہب کے رہنماؤں کا اجتماع ہے، سب سے پہلے طاسین گوتم کا تعارف ہے، گوتم ایک رقاصہ سے مخاطب ہیں پانچ شعر کی پہلی غزل پڑھتے ہیں، مطلع ہے:

مئے دیرینہ و معشوق جواں چیزے نیست پیشِ صاحب نظراں حور و جناں چیزے نیست

پانچ اشعار کی یہ غزل نو سال قبل 'زبور عجم' میں شائع ہو چکی تھی، جسے اقبال نے حالیہ تخلیق میں ضم کر لیا، تکرار کے اسباب معلوم نہیں، مانا کہ فکر و فن کے اعتبار سے غزل برمحل ہے اور موزوں بھی مگر ہے تکرار، حمایت میں ایک دلیل دی جاسکتی ہے کہ جب دوسروں کے تصورات اور تخلیق سے استفادہ کیا جاسکتا ہے تو اپنی ہی تخلیق کا حوالہ کیوں نہیں دیا جاسکتا، فن کار کو حق ہے کہ جہاں چاہے استعمال کرے، اس استصواب سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، اس موضوع سے متعلق دوسرے مباحث بھی زیر بحث لائے جاسکتے ہیں، جنہیں سرِ دست نظر انداز کیا جارہا ہے، ادبی اظہار میں حرف مکرر کی بڑی اہمیت ہے، اس کے بغیر بات نہیں بنتی، دو نے التفات کے لیے اسے لازم سمجھا گیا ہے، شاعری میں ایک ہی موضوع کو سو رنگ میں بیان کیا جانا بھی حسن ہے، 'زبورِ عجم' کے حصۂ اول کی ۴۸ ویں غزل ہے جو اس اعتبار سے بہت معروف ہے کہ مطلع کا مفہوم کم و بیش بالِ جبریل کی غزل میں بھی ہے:

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

فارسی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو :

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بیقرار را یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تاب دار را

زبور میں اس غزل کے اشعار کی تعداد چھ ہے، جاوید نامہ میں گوتم بدھ نے جس رقاصہ کو مخاطب کیا تھا، اس نے بھی زبور عجم کی غزل مذکورہ بالا دہرائی ہے، درمیان میں ایک غزل کا وقفہ ہے ورنہ گیارہ اشعار یا دو غزلوں کا نقل کیا جانا زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا، فن کار کی تخلیقی راز جوئی تک قاری کی رسائی ممکن نہیں اس لیے ان کے انتخاب یا تکرار کو تسلیم کرنے میں قباحت نہیں ہے، مطالعہ اور تجزیہ میں اشکال کا پیدا ہونا ایک فطری اور احتسابی عمل ہے، جسے جاری رہنا چاہیے، اقبال غالب کے بڑے معترف ہیں، جاوید نامہ میں نوائے غالب کے عنوان سے غالب کی انقلابی غزل کے چھ اشعار شامل ہیں:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

حسن آفرینی کے لیے لفظوں کا تکرار بیانیہ کے حسن کو دوبالا کرتا ہے، سامعتوں کو متوجہ اور تاثر

کو شدید تر بنانے کے لیے بھی مستعمل ہے، ان سب سے قطع نظر صوت وصدا میں نغمگی، غنائی کیفیت شاعری کے اساسی عناصر ہیں، جو خوش آہنگ لفظوں کے بغیر ممکن نہیں ہے، اقبال نے بارہا لفظوں کے تکرار سے بڑا حسن پیدا کیا ہے، یہ تکرار مصرعوں کا یا مشترک الفاظ کا، کلام اقبال میں اس کی بڑی دلآویز صورتیں موجود ہیں، ''زبور عجم'' میں نوع بنوع مثالیں ملتی ہیں، ایک مشہور غزل کا دل فریب آہنگ تکرار سے ہی پیدا ہوا ہے:

از چشم ساقی مست شرابم   بے مے خرابم بے مے خرابم

''زبور'' کی ہی دوسری غزل کا مصرع ملاحظہ ہو:

فریاد بے سود، فریاد بے سود

''زبور'' میں ایک غزل آہنگ کے اعتبار سے یکتا و یگانہ ہے، جس کا سارا حسن مصرعوں اور ترکیبوں کے تکرار سے غنائی حسن کا جادو جگاتا ہے، میرا اندازہ ہے کہ اس نوعیت کی غزل اور تکرار پورے کلام میں کہیں اور نہیں ہے:

ایں ہم جہانے، آں ہم جہانے   ایں بیکرانے آں بیکرانے
ایں یک دو آنے، آں یک دو آنے   من جاودانے، من جاودانے
ایں کم عیارے، آں کم عیارے   من پاک جانے نقد روانے
ایں جا مقامے آنجا مقامے   ایں جا زمانے، آں جا زمانے
اینجا چہ کارم، آں جا چہ کارم؟   آہے فغانے، آہے فغانے
ایں رہزنِ من، آں رہزن من   ایں جا زیانے، آں جا زیانے
ہر دو فروزم، ہر دو بسوزم   ایں آشیانے، آں آشیانے

''زبور عجم'' میں کئی جگہ بند کے آخری مصرع کی تکرار نے موسیقی کی بڑی دلکش صورتیں پیدا کی ہیں، اقبال نے روایتی اسالیب کا بڑا فائدہ اٹھایا ہے اور اس میں اختراع و اجتہاد کی صورت بھی پیدا کی ہے۔ جیسے:

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

نظم میں سات بار اس مصرع کی تکرار نے لے اور آہنگ میں سحر ساز دل کشی پیدا کی ہے،

ایک دوسری نظم کا بند ملاحظہ ہو:

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعلِ ناب از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

اے انقلاب! اے انقلاب!

پیام مشرق میں کئی مصرعوں نے تکرار کے آہنگ کی اعجاز نمائی کی ہے، مختلف نظموں میں بہت ہی متنوع مرقعے موجود ہیں، گوئٹے کی مشہور نظم نغمۂ محمدؐ کا اقبال نے آزاد ترجمہ کیا ہے، چار بند کی نظم میں ٹیپ کا شعر ملاحظہ ہو:

زی بحر بے کرانہ چہ مستانہ می رود در خود یگانہ از ہمہ بے گانہ می رود

نظم ''حدی'' (نغمۂ ساربانِ حجاز) میں حسب ذیل مصرع کو بند کے آخری مصرع کے طور پر آٹھ بار دہرایا گیا ہے ؎

تیز ترک گامزن منزلِ ما دور نیست

اقبال کے فنی اجتہاد کی بڑی دلفریب تصویر نظم ''فصلِ بہار'' میں ملتی ہے یہ چھ بند کی نظم ہے، ہر بند میں سات مصرعے ہیں شروع اور آخر کے مصرعے قدرے طویل اور تکرار کے ساتھ نظم کیے گئے ہیں، درمیان کے پانچ مصرعے مختصر ہیں، ہیئت کے امتیاز سے آہنگ کا سرود پیدا کیا گیا ہے، ہر بند میں دو مصرعوں کا تکرار عجب حسن آفریں ہے:

حجرہ نشینی گزار، گوشۂ صحرا گزیں
برلبِ جوئے نشیں
آبِ رواں راہ بیں
نرگسِ ناز آفریں
لختِ دل فرو دیں
بوسہ زنش برجبیں
حجرہ نشینی گزار، گوشۂ صحرا گزیں

اشعار، مصرعوں اور لفظوں کے تکرار کا تذکرہ تھا، کلام اقبال میں صوتی تکرار کا سحر ساز حسن

بہت اہم ہے،ظاہر ہے کہ آواز حرفوں اور لفظوں کی محتاج ہوتی ہے اور انہیں کی موزونیت سے صوتی آہنگ پیدا ہوتا ہے،تکرار کے استعمال سے صوتی اسالیب کا نگار خانہ تیار کیا جاتا ہے،اقبال کی خوش آہنگ نغمہ سرائی کے سبھی معترف ہیں،ان کے اشعار کا ساز کے نازک اور لطیف ترین تاروں پر گائے جانے کا حیرت انگیز عمل جاری ہے، ہر دور کے ممتاز گلوکاروں کی شناخت کلامِ اقبال سے کی گئی ہے، آہنگ کے یہ اسالیب ہم آواز لفظوں سے کبھی کبھی بے نیاز بھی ہوتے ہیں،کلام میں وافر مثالیں موجود ہیں، پیام مشرق کی نظم کشمیر کے ابتدائی دو شعر دیکھیے:

رخت بہ کاشمر کشا ، کوہ و تل و دمن نگر سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

باد بہار موج موج ، مرغِ بہار فوج فوج صلصل وسار زوج زوج برسرِ نارون نگر

جہانِ آب وگل کے تعارف وتوصیف میں محاورہ بن جانے والا مصرع لفظوں کے اجتماع پر مبنی ہے۔

سوز وساز ودرد وداغ وجستجوئے آرزو

جاوید نامہ میں تکرار کے ساتھ ساتھ رومی، غالب اور خود اقبال کی غزلیں شامل ہیں،متفرق اشعار بھی ہیں،تقریباً پچاس سے چھ زائد اشعار نظر میں ہیں،اقبال کی تخلیقی فعالیت دیکھیے کہ وہ صرف فارسی کے شیریں اور مترنم لفظوں پر اکتفا نہیں کرتے انہیں عربی اور اردو لفظوں میں یہ کیفیت پیدا کرنے پر عبور حاصل ہے ضربِ کلیم کی نظم ''لا الٰہ'' کے صوتی تکرار کا حسن اسی کلمے کی دین ہے۔

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
تجھ سے مرے سینے میں آتش اللہ ھو

اردو کے لفظوں سے پیدا ہونے والا آہنگ ملاحظہ ہو یہ بال جبریل کے حوالے ہیں۔

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ،اپنا تو بن

ساقی نامہ کے یہ الفاظ دیکھیے،الفاظ اردو نژاد ہیں،مگر آہنگ کا شکوہ اور شور بے مثال ہے۔

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

اقبال کی نغمہ سرائی زبان واسالیب کی فصلِ گل ولالہ کا پابند نہیں ہے اور نہ ہی بہار وخزاں کا محتاج ہے، قدرت نے انہیں بڑی فیاضی سے بے پناہ اور لازوال تخلیقی قوت بخشی تھی، اسی کے طفیل آہنگ واسالیب میں حیرت خیز نور فشانی ہوتی ہے، اقبال کبھی کبھی لفظوں کے اجتماع سے نغمگی پیدا کرتے ہیں، قواعد وزبان کے آداب برطرف ہوتے ہیں، صوتی آہنگ کی فضا سازی اقبال کے فن کا امتیاز ہے، ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں 'بانگِ درا' حصہ سوم کی نظم 'میں اور تو' کے پُر کیف آہنگ کو دیکھیے:

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفس عدم　　ترا دل حرم، گرِ عجم، ترا دیں خریدۂ کافری
دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی　　غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

لفظوں کے تکرار سے کہیں زیادہ صوتی تکرار نے ایک نئے آہنگ کی تشکیل کی ہے، صوتی حسن آفرینی کی نادر ونایاب مثالوں سے اقبال کی شاعری معمور ہے۔

اس عاجزانہ تجزیہ کا حاصل یہ ہے کہ اقبال کے ذخیرۂ تخلیق میں اشعار کے اقتباس اور مکرر حوالے اگر مناسب نہیں لگتے تو دوسری جانب مصرعوں اور لفظوں کے تکرار وتناسب نے ان کے فن کو حیرت انگیز لازوال جاودانی بخشی ہے، فن کی دارائی وسکندری کے مشاہدے کے لیے شعرِ اقبال چراغِ رہ گزر ہے اور ناز آفریں تخلیق بھی۔

تصوف ـــــ علامہ شبلیؒ کی ایک نادر تقریر

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی [۱۸۵۷ـ۱۹۱۴ء] کو خطابت کا خداداد ملکہ حاصل تھا اور وہ اپنے عہد میں ملک کے بے مثل مقرر و خطیب تسلیم کیے جاتے تھے۔ اعظم گڑھ تو ان کا وطن ہی تھا، علی گڑھ، حیدر آباد، دہلی، بھوپال، لکھنو، رام پور اور بمبئی کے متعدد اجلاسوں اور کانفرنسوں کو انہوں نے خطاب کیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی وہ برابر شریک ہوتے اور کسی موضوع پر تقریر کرتے یا قراردادیں پیش کرتے اور مباحثہ میں حصہ لیتے۔ اسی طرح کا ایک خطبہ انہوں نے دہلی میں بھی دیا تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳ـ ۱۹۵۶ء] نے جو ''خطبات شبلی'' یکجا کیے ہیں، اس میں یہ خطبہ شامل نہیں ہے۔ ۲۰۱۸ء میں راقم نے علامہ شبلی کی نادر تحریروں کا مجموعہ ''نوادرات شبلی'' شائع کیا تو اس میں سات نودریافت خطبے شامل کیے تھے۔ یہ آٹھواں نودریافت خطبہ ہے۔ پندرہ برس پہلے راقم نے علامہ شبلی کی نادر و نایاب اور منتشر تحریروں کی شیرازہ بندی کے جس منصوبے کا آغاز کیا تھا اور جو کئی جلدوں پر محیط ہوا، تعجب ہے وہ سلسلہ اب تک جاری ہے، زیر نظر خطبہ کی دریافت اس سلسلہ کی تازہ مثال ہے۔

۱۹۰۹ء کے وسط میں علامہ شبلی نے دہلی کا سفر کیا اور اپنے دوست خواجہ حسن نظامی [۱۸۷۶ـ ۱۹۵۵ء] کی خواہش پر ان کے یہاں قیام کیا، یہ قیام نواب غلام نصیر الدین عرف نواب بڈھن میاں رئیس شیخوپورہ کی محل سرا واقع چتلی قبر میں تھا، جو اس وقت خواجہ صاحب کے تصرف میں تھی، ماہنامہ نظام المشائخ کا دفتر بھی اسی میں تھا، یہاں علامہ شبلی کا قیام ایک ماہ رہا، وہ اپنا باورچی ساتھ لے کر آئے تھے، سالن خود تیار کرتے، بقیہ کام باورچی نپٹاتا تھا، اس مدت میں انہوں نے سوائے لالہ چندولال چانول والے کے جو دہلی کے ایک رئیس اور شاعر تھے کسی کی دعوت قبول نہیں کیا اور یہ دعوت بھی انہوں نے

رفیق اعزازی دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

خواجہ صاحب کی خواہش پر قبول کی تھی۔(۱)

اس قیام دہلی میں ان کی دو تقریروں کا ذکر ملتا ہے، ایک تقریر انہوں نے جامع مسجد میں حوض کے پاس چاندنی رات میں کی تھی اور دوسری تقریر کا اہتمام خواجہ حسن نظامی نے اسی نواب بڈھن میاں کی محل سرا میں کیا تھا، حالانکہ اس زمانہ میں خواجہ صاحب کی اہلیہ سخت علیل تھیں اور پھر اسی علالت میں انتقال بھی کر گئیں لیکن خواجہ صاحب کے معمولات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا،(۲) علامہ شبلی نے ان سے کہا کہ:

"خواجہ صاحب میری بیوی کا جب انتقال ہوا تھا میں پاگل سا ہو گیا تھا لیکن آپ ہیں کہ برابر اپنے مشاغل میں مصروف ہیں، گویا کچھ ہوا ہی نہیں، آپ واقعی بہت مضبوط طبیعت کے انسان ہیں۔"(۳)

اسی حال میں خواجہ صاحب نے عمائدین دہلی کو مدعو کیا اور تعجب ہوتا ہے کہ تصوف جیسا خشک موضوع ہونے کے باوجود تقریباً دو ہزار افراد اس جلسے میں شریک ہوئے، اس کی تفصیل خود خواجہ صاحب نے نظام المشائخ میں لکھی ہے، انہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

"مرحومہ کی نازک علالت کے زمانہ میں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی دہلی تشریف لائے اور باوجود تمام عمائدین دہلی کے اصرار کے انہوں نے میری عرض قبول فرمائی اور حلقہ کی منزل گاہ میں قیام فرمایا، اراکین وخدام حلقہ نے خواہش کی کہ اگرچہ مولانا کے علمی کارناموں کا تمام اسلامی دنیا میں غلغلہ ہے اور مشائخ تصوف کے حالات سے بھی مولانا نے دلچسپی ظاہر فرمائی ہے، جس کا ثبوت سوانح مولانا روم ہے مگر آج تک مولانا کی زبان سے تصوف کی حقیقت کے بارہ میں کچھ نہیں سنا، کیا اچھا ہو کہ حلقہ میں مولانا کا ایک بیان تصوف پر ہو جائے، مولانا نے اس خواہش کو قبول فرمایا، مگر ساتھ ہی ازراہ انکسار اس کوچہ سے نابلد ہونے کا عذر کیا، القصہ اس روحانی جلسہ کا عام طور سے اشتہار تقسیم کیا گیا اور دو ہزار کے قریب عمائدین وعوام ہندو مسلمانوں کا مجمع منزل گاہ حلقہ میں ہو گیا، جامع مسجد کے امام صاحب صدر بنائے گئے، شفاء الملک حکیم رضی الدین احمد خاں صاحب کی طرف سے حاضرین کو مولانا کی تعریف سنائی گئی اور

جناب قاری سرفراز حسین صاحب چشتی نظامی سیاح جاپان نے اول اغراض حلقہ کے متعلق نہایت مشرح ومدلل تقریر کی ،اس کے بعد کامل دو گھنٹہ مولانا شبلی نے اپنا عارفانہ لکچر دیا، یہ بیان علاحدہ چھاپا جارہا ہے، مولانا نے تصوف کو تین حصوں میں تقسیم کرکے دکھایا، اول فلسفہ، دوم اخلاق، سوم حال، ان تینوں کی تشریح میں اس قدر واقفیت اور معلومات ظاہر کی کہ لوگ حیرت زدہ ہوگئے، وحدت وجود کو وحدت شہود پر ترجیح دینے میں کمال دکھادیا، الغرض بیان ہمہ وجوہ مکمل اور پسندیدہ تھا اور بقول مولانا شبلی یہ پہلا دن تھا جو انہوں نے تصوف کے متعلق تقریر کی۔''(۴)

ملا واحدی نے اپنی کتاب ''تاثرات'' میں لکھا ہے کہ علامہ شبلی کے دہلی آنے کا سنہ ۱۹۰۸ء ہے،(۵) اس تسامح اور نظام المشائخ کی کمیابی کی وجہ سے ہم کو اس خطبہ کو اب حاصل کرنے میں سالوں لگ گئے، یہ خطبہ نظام المشائخ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۷ھ میں شائع ہوا ہے، نائب مدیر سید محمد ارتضی معروف بہ ملا واحدی نے اس پر ایک نوٹ لکھا ہے جو قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں نقل کیا جارہا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''جب حلقہ میں تصوف کے مضمون پر مولانا شبلی نے تقریر کرنی منظور کرلی تو دہلی میں اس کا اشتہار تقسیم کیا گیا، جس میں مولانا کے اس موضوع تقریر کو عارفانہ لکچر کے لفظ سے ظاہر کیا گیا تھا، مولانا نے تقریر کی تمہید میں اس لفظ کو بے جوڑ بتایا کہ عارفانہ کے ساتھ لکچر موزوں نہیں، جب مولانا بیان ختم کرچکے تو حضرت مدیر اعلیٰ مولانا خواجہ حسن نظامی نے تقریر پر اظہار رائے کرتے ہوئے مولانا کو چودہویں صدی کے شبلی سے یاد کیا، گویا عارفانہ لکچر کے لفظ کو اس لطیف طریقہ سے درست کردیا یعنی نام اور کلام کے اعتبار سے یہ بیان عارفانہ بیان تھا، مگر چودہویں صدی کے طرز ادا کے سبب اس کا موزوں نام لکچر ہی ہوسکتا تھا۔

ہم نے بھی اس تقریر کا عنوان عارفانہ لکچر مذکورہ وجہ سے رکھ دیا ہے، خدا تعالیٰ وہ دن جلد لائے کہ ہمارے نامور اور مایہ ناز علامہ شبلی نعمانی اسم بامسمی شبلی وقت مانے جائیں اور قال کے ساتھ حال کا صیغہ بھی ان کے ارشاد میں پیدا ہوجائے، اس وقت عارفانہ

لکچر کی بجائے عارفانہ خطبہ کے لفظ کو استعمال کرنا ضروری سمجھیں گے۔‘‘(۶)

ملا واحدی کی یہ حسرت، حسرت ہی رہ گئی۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دو گھنٹے کا یہ خطبہ مکمل نقل نہیں کیا جاسکا ہے، جیسا کہ ملا واحدی نے اپنے نوٹ میں بھی لکھا ہے(۷)، جن تین اشخاص کو اس خطبہ کے نقل کرنے پر معمور کیا گیا تھا، اس میں ایک ضیاء الدین احمد برنی [۱۹۶۹-۱۸۹۰ء] کا نام بھی شامل تھا، اپنی کتاب ’’عظمت رفتہ‘‘ میں انہوں نے اس خطبہ کی تفصیل لکھی ہے۔

خطبہ

موضوع بحث آج یہ ہے کہ تصوف کیا چیز ہے اور اسلام سے اس کا تعلق کیا ہے، شریعت اور طریقت دو جداگانہ چیزیں ہیں یا ایک ہیں، ایک گروہ کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کا تصوف قرن اول اور قرن ثانی کے بعد پیدا ہوا ہے اس لیے اس کو اسلام سے علاحدہ سمجھنا چاہیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصوف شریعت کا حصہ اور شاخ ہے، صرف نام کے باعث جداگانہ چیز سمجھی جاتی ہے، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین اجمالی اور مجموعی تھی، بعد میں شاخیں اس تعلیم کی علاحدہ علاحدہ ہوگئیں اور وہ جدا جدا علم ہوگئے، محدث جامع الاقوال تھے جو مسائل متعلق عبادت تھے احکام فقہ ہوگئے، اخلاق کے متعلق جو اقوال تھے ان کا نام اخلاق ہوگیا، ترکیب جمع سے ہر ایک نے جداگانہ نام پائے، ورنہ سب چیزیں اس وقت موجود تھیں، البتہ ایک سو چالیس برس کے بعد جمع اور قلم بند ہوئیں، اس لحاظ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی، صرف مرتب بعد میں ہوئی ہیں، مثلاً ڈاکٹری پورے علاج کو کہتے ہیں، خواہ اندرونی ہو یا خارجی اور اس کی ہر شاخ کو لیا جائے تو جراحی جدا فن ہے اور آنکھ کا علاج علاحدہ ہے، اس طرح ایک شاخ بجائے خود ایک مستقل فن ہے حالانکہ ایک ہی چیز ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحبؒ اپنے مکاتیب میں شریعت طریقت اور حقیقت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ مرض کی تشخیص کا نام شریعت ہے جو عبادت نماز وغیرہ فرائض کے احکام بتاوے گی یعنی ایک نسخہ لکھ دے گی، اس نسخہ کو بوقت ضرورت استعمال کرنے اور برتنے کا نام طریقت ہے اور اچھا ہو جانا، شفا پا جانا حقیقت ہے، مولانا روم نے یہ تشبیہ دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا شناسی

کیونکر پیدا ہوتی ہے، آگ کو دور سے دیکھ کر یا اس کی گرمی محسوس کر کے یہ معلوم ہونا کہ یہ آگ ہے شریعت ہے، اور آگ کی لپٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر متاثر ہونا طریقت ہے، اور اس میں پڑ کر خود آگ ہوجانا حقیقت ہے:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست کتب خانہ چند ملت بشست

تزکیہ نفس کا نام تصوف ہے، روح کو کینہ ہوا و حرص غصہ سے آپس کی رنجش اور طمع وغیرہ امراض سے پاک کرنے کا نام طریقت ہے، جس طرح جسمانی بیماریاں ہوتی ہیں اسی طرح روح کو بھی قسم قسم کے امراض لاحق ہوتے ہیں، جسم کے طبیب ڈاکٹر حکیم ہیں اور روح کے معالج انبیا اور اولیا ہیں، فرق صرف مادہ اور روح کا ہے، درخت میں تازگی اور بالیدگی کی قوت ہوتی ہے، جس کے بغیر وہ بیکار ہے، نہ بڑھ سکتا ہے، نہ پتہ اور شاخیں قائم رہ سکتی ہیں، اسی قوت کا نام روح ہے، نماز ہم بھی پڑھتے ہیں، مگر ہماری نماز اور عارف کی نماز میں بہت فرق ہے، گو دیکھنے میں وہ ہماری طرح رکوع اور سجود کرتا ہے مگر باطن میں نماز اس کی کچھ اور ہی چیز ہے، آیت اور تلاوت تو وہ ہماری ہی طرح کرتا ہے، مگر وہ عن الفحشاء والمنکر کا کا پورا عامل ہوتا ہے، وہ شریعت سے ایک اندرونی جدا طریقہ ہے، شریعت بیرونی محافظ ہے اور آپ نے سنا ہوگا:

محتسب را درون خانہ چہ کار

ماہ رمضان المبارک میں بعض اسلامی ممالک کے اندر شراب سربازار فروخت نہیں ہوسکتی، اگر ایسا ہو تو محتسب پکڑ لے، مگر کوئی گھر کے اندر بیچے تو اس پر محتسب کا کیا زور چل سکتا ہے، ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شب کو گشت لگا رہے تھے، ایک مکان سے گانے کی آواز آئی، آپ نے سمجھ لیا کہ یہاں منہیات شرعی ہو رہی ہیں، اس خیال سے آپ مکان کی پشت کی جانب سے جا کر مانع ہوئے، مکان دار نے کہا کہ حضرت اگر مجھ سے ایک گناہ ہوا ہے تو آپ سے دو گناہ سرزد ہوئے، اول یہ کہ مکان کے باہر کے دروازہ سے آنے کا حکم ہے اور آپ نے اس کے خلاف ورزی کی ہے، آپ خاموش واپس چلے گئے، یہ معنی شریعت ظاہری کے ہیں اور ان احکام کا پابند ہونا تصوف ہے:

مابروں را ننگریم وقال را مادروں را بنگریم وحال را

صحابہ کرامؓ مختلف طور سے تلقین پاتے تھے، استعداد کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ان کو تعلیم دیتے تھے، صحابہ کی جیسی حالتیں مختلف تھیں ویسی ہی جداگانہ ان کی تعلیم تھی، مثلاً خالد بن ولیدؓ سپہ سالار، حضرت ابوہریرہؓ نے چھ ہزار حدیث جمع کی، اصحاب صفہ اسی (۸۰) تھے جن کا کام یہ تھا کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر مسجد کے چبوترہ پر بیٹھ رہیں اور شب و روز عبادت میں گذار دیں، ان کی خوراک صرف یہ تھی کہ مالدار صحابہؓ کھجور کے خوشے لاکر محراب مسجد میں لٹکا دیتے تھے جن سے کھجوریں ایک ایک دو دو ٹپکتی تھیں اور وہ اصحاب صفہ میں سے جس کے حصہ میں آجائیں اسی کی خوراک ہوتیں اور جن کو کھجوریں نہ ملتیں اور بھوک کی شدت ہوتی وہ پیٹ سے پتھر باندھ لیتے تھے، ایک صحابی کو جب کئی روز متواتر فاقے ہوئے اور پتھر باندھنے پر بھی ان کی سیری نہ ہوئی تو انہوں نے تلاش خوراک کی اس طرح شروع کی کہ اس زمانہ میں قاعدہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو جو شخص اس مسئلہ کو بتاتا دریافت کرنے والے کو کھانا بھی اپنے پاس سے کھلاتا، چنانچہ جب وہ صحابی چلے تو سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نظر پڑے، ان سے مسئلہ دریافت کیا مگر ان کے پاس کچھ موجود نہ تھا جو ان کو کھانے کو دیتے، اس لیے وہ طرح دے کر آگے بڑھ گئے، پھر حضرت فاروقؓ آرہے تھے، ان سے اس صحابی نے مسئلہ دریافت کیا، وہاں بھی کچھ نہ تھا، اس لیے وہ بھی آگے بڑھ گئے، ان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے، جب ان سے مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے حال پوچھا، گھر لے گئے اور تھوڑا دودھ پلایا۔

غرض جس صحابی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو مادہ زیادہ پاتے تھے اسی کے موافق تعلیم دیتے تھے، غبی ذہین ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ان کو ایک پیمانہ پر لانا نبوت کی کمی اور نقص کا باعث ہے اور خدا تعالی خاتم النبیین کی شان میں فرماتا ہے: اکملت لکم دینکم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میری مثال اس دیوار کی ہے جو تعمیر ہو کر تیار ہوگئی ہے، صرف ایک اینٹ کی جگہ اس میں خالی ہے۔

ہمہ رنگی آفتاب ماہتاب چراغ ستارے سب چیزیں جدا جدا صورت میں بھلی معلوم ہوتی ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تلقین امیر غریب کے لیے یکساں تھی، وہ سب کو تارک الدنیا بنانا چاہتے تھے، آپ کا قول تھا کہ دولت مند بہشت میں داخل نہیں ہوں گے، تحقیق یہ تھی صلاحیت جس نیکی کی جس شخص میں دیکھی اسی کی طرف اس کو بڑھایا اور درجہ تکمیل کو پہنچایا، امیر معاویہؓ کو بے نظیر ملکی مدبر

بنادیا، فقر کا حصہ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت علیؓ پر ختم ہے اور یہ سلسلہ انہیں دونوں حضرات پر منتہی ہوتا ہے، ایک مرتبہ جنگ میں حضرت علیؓ کے جسم کے اندر ایک تیر ایسا پیوستہ ہوا کہ وہ کسی طرح نہ نکل سکا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت ہم نماز میں مشغول ہوں اس وقت یہ تیر نکال لیا جائے، چنانچہ جس وقت آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تیر نکالا گیا، گوشت میں ٹانکے لگے، زخم کی مرہم پٹی ہوئی مگر آپ کو مطلق خبر نہ ہوئی، یہ ہے عارفوں کی نماز اور حقیقی نماز، اس لحاظ سے ابو ہاشم صوفی اول تھے، مسئلہ وحدۃ الوجود کا پرتو اور حقیقی وجود کی مثال درخت کے سایہ کی ہے کہ سایہ بھی مثل درخت کے ہے اور متحرک بھی ہوتا ہے، مگر درخت سے بالکل علاحدہ چیز ہے اور دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں، اسی کے وجود کا پرتو ہے، اسی طرح یہ عالم اسی وجود کا پرتو ہیں اور یہ تمام صورتیں اسی ایک ذات کے نتائج ہیں، جس طرح چراغ کی روشنی ہم تنہائی میں محسوس کرتے ہیں مگر آفتاب کی روشنی میں اگر چراغ جلایا جائے تو ہم کو چراغ کی روشنی بالکل دکھائی نہ دے گی، حالانکہ موجود ہوگی، اسی طرح ہم ممکنات ہیں اور خدا کے وجود کے سامنے دکھائی نہیں دیتے، یہ شہود کی دلیل ہے، مگر جو یہ کہتے ہیں کہ ہم وہ ہی ہیں، دراصل ایک ہی وجود ہے جو سب جگہ موجود ہے، بات یہ ہے کہ سب خدا تعالیٰ ہی کے مظاہر ہیں:

یا وحدت حق بہ کثرت خلق چہ پاک گر صد جائے گرہ زنی رشتہ یک است

بجز دھاگے کے کچھ نہیں ہے، گرہ بذات خود کوئی وجود نہیں رکھتی، گو اس کا نام بالکل علاحدہ ہے، یہ خدا کے وجود کا فلسفہ سے ثبوت ہوا۔

قرآن شریف میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے یہ بزرگ استدلال کرتے اور حجت لاتے ہیں، قرآن شریف کا کلام ایسا پر معنی ہے کہ ہر شخص اس سے جداگانہ مطلب سمجھتا ہے، مثلاً مسح کی نسبت ایک امام فرماتے ہیں کہ سارے سر کا مسح کرنا چاہیے، دوسرے ارشاد کرتے ہیں کہ نصف سر کا لازمی ہے، تیسرے ایک بال کا تر ہوجانا کافی خیال کرتے ہیں، حالانکہ الفاظ ایک ہی ہیں، مگر تین جداگانہ طور پر مسئلے اس سے سمجھے جاتے ہیں، مجتہد کو ہر مسئلہ کی ایجاد پر دس ثواب ہوتے ہیں اور وہ غلطی بھی کرے تب بھی ایک ثواب کا وہ ضرور مستحق ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت سفر میں چند صحابیوں سے ارشاد فرمایا کہ نماز عصر کی ہمارے ساتھ پڑھنا، اتفاق ایسا ہوا کہ نماز عصر کا وقت تنگ ہونے لگا تو بعض کی ان میں سے

یہ رائے ہوئی کہ نماز پڑھ لینی چاہیے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب تھا کہ ہمارے پاس پہنچ جاؤ تو ہمارے ساتھ پڑھنا اور بعض نے ان میں سے یہ خیال کیا کہ نہیں حضور کا یہ فرمان تھا کہ نماز ہمارے ہی ساتھ پڑھنا چاہیے کتنا وقت تنگ رہ جائے، چنانچہ بعض نے نماز ادا کی، بعض نے قضا کی اور منزل پر پہنچ کر دونوں فریق آنحضرت ﷺ کے حضور میں پیش ہوئے اور اپنا اپنا حال عرض کیا، حضور نے دونوں کو معاف کر دیا، اس وجہ سے کہ وہ الفاظ ہی ایسے تھے جن سے دونوں نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق مطلب سمجھا تھا، اسی طرح قرآن شریف کا کلام پاک ہے، اس میں سب کچھ ہے مگر سمجھنے والا چاہیے، ھو الاول ھو الآخر ھو الظاھر ھو الباطن سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ظاہر اور باطن میں وہی ہے اور اسی سے ان بزرگوں کا یہ مسئلہ ثابت ہو جاتا ہے، ہاں جو لوگ یہ کہیں کہ میں خدا ہوں وہ پکے موحد نہیں، اسی لیے منصور کو سزا دی گئی، سولی پر چڑھایا گیا، کیونکہ اس نے میں ! اپنے کو خدا سے جدا ٹھہرایا، اگر وہ یہ کہتا کہ خدا ہی خدا ہے تو ٹھیک تھا، اس نے پہلے میں کہا جس سے سمجھا گیا کہ خدا کی ذات سے میں کوئی علاحدہ چیز ہے، یہ وحدت نہ رہی۔

تصوف کا اثر اخلاق پر اور جذبات پر پڑتا ہے، جس سے عالمگیر صبر و رضا پھیلتی ہے، وحدۃ الوجود کا مسئلہ کفر بد باطنی کے خبائث کو دل سے مٹاتا ہے:

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

زیں عشق بہ کونین صلح کردم تو خصم باش ورنا دوستی تماشا کن

ایک صوفی صاحب کا یہ قول تھا کہ سورج میرے حکم پر طلوع و غروب ہوتا ہے، آسمان و زمین میرے اشارہ پر حرکت کرتے ہیں، نظام عالم میرے ہی واسطے قائم ہے، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے اپنی ہستی کو محو کر دیا تھا اور فنا فی اللہ کے درجہ تک پہنچ گیا تھا، یا یوں کہیے کہ جو کچھ تقدیر الٰہی میں ہوتا اس کو وہ اپنی مرضی کے موافق سمجھ کر راضی ہو جاتا، سچ تو یہ ہے کہ رضینا بالقضا کا مسئلہ بغیر توحید وجودی کے پیدا نہیں ہوتا:

روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست نامے تو بہر زباں کہ گویند نکوست

دل جز غم عشق نہ جوید ہرگز یا جز درہ تو نہ ہوید ہرگز

صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد تا مہر کسے جز تو نہ روید ہرگز

ایک صوفی کو شیخ الاسلام ہرات نے کافر کہا تو صوفی نے اپنے ہی نفس کو ملامت کی کہ میں تجھ

کو پچاس سال سے کہتا تھا کہ اے نفس تو کافر ہے مگر تجھ کو یقین نہ آتا تھا، اب شیخ الاسلام کی زبان سے سن کر تو تجھ کو یقین آیا کہ تو کافر ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر شریف میں جس وقت تشریف لائے ہیں تو ان کے قلب کی تلوار اور روحانی اثر سے صدہا مسلمان ہوگئے، ان کے پاس سوائے روحانی اثر کے اور کیا تھا۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شام پر چڑھائی تھی، یادگار زمانہ ہے کہ وہ زبانی تصفیہ کی درخواست پر مدینہ سے ایک اونٹ اور ایک غلام لے کر روانہ ہوئے، غلام سے یہ قرار پایا کہ تین تین کوس کی باری رہی، پہلے ہم تین کوس اونٹ پر سوار ہوں پھر تم سوار ہونا، اور اسی طرح یہ سفر طے کیا جائے گا، چنانچہ جب سفر ختم کے قریب پہنچا تو غلام کی باری سواری کی تھی، غلام نے عرض کیا کہ شان وشوکت دکھانے کا موقع آگیا، اب آپ سوار ہو لیجئے، میں اونٹ پر سے اتر جاتا ہوں، مگر آپ نے نہ مانا اور خلاف باری اونٹ پر سوار ہونا منظور نہ کیا، اس حالت نے ایسا اثر ڈالا کہ ہزاروں کفار مسلمان ہوگئے، بات یہ ہے کہ ہرچہ از دل خیزد بدل نشیند:

ترا کے میسر شود ایں مقام　　که بادوستانت خلاف است جنگ

عقائد کے بعد علم کا درجہ ہے، علم کو صوفیائے کرام دو قسم کا بتاتے ہیں، ان کا مقصد علم ظاہری نہیں جو حواس کے ذریعہ معلوم ہو سکے، بلکہ دل کو صاف کرنا اور توجہ کرنا، انکشاف قلب ہو کر ہر شئی کا علم ہوتا ہے، قدر ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی۔

امام غزالیؒ نے بعد عرصہ بسیار کے یہ درجہ حاصل کیا تھا، جب ایک گنبد میں جا کر گوشہ نشیں ہوئے تھے، اس وقت فرمایا تھا:

فکان ماکان ممالست الذکری　　فظن خیراً ولا تسئله ضمیری

جب ایسے عالم یہاں آ کر قائل ہو جاتے ہیں تو ہم کس شمار میں ہیں، علم کے بعد اخلاق ہے، نفس کشی، تواضع، انکسار اور اخلاص خاص ہے، جس کے معنی ہیں کھرا کر دینا، جو مسلمانوں میں آج کل مفقود ہے، یعنی جو کام کرتے ہیں اس میں ان کی ظاہری نیت اور ہوتی ہے اور باطن میں مقصود کچھ اور ہوتا ہے۔

اگر مدرسہ قائم کر کے فیض پہنچانا چاہیں گے تو اس میں اپنے کسی عزیز کو ملازم کرانا اور خود مولوی صاحب کہلانے کا منشا ضرور ہوگا۔

یہ نفس کی چوریاں ہیں جن کو اگلے لوگ نہیں جانتے تھے، مگر ہم دیدہ ودانستہ ان خبائث سے باوجود آگاہ ہونے کے ان کو کرتے ہیں۔

ایک مولوی صاحب نے ایک شہر میں وعظ کہا، دوسرے واعظ نے زیادہ اثر ڈالا، پہلا واعظ اس نے بجائے خوش ہونے کے حسد کرنے لگا، یہ اخلاص ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

خدا غیرت مند ہے، وہ دوسرے کو چاہتا نہیں دیکھ سکتا، یہی حال اس کے علم کا ہے:

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری　　غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

(شبلی نعمانی)

خودی سے بے خودی میں آ جو جوش حق پرستی ہے　　جسے تو نیستی سمجھا ہے اے غافل! وہ ہستی ہے

کیا جانے کسے دیکھ رہا ہوں میں بتوں میں　　آنکھوں میں ہے کچھ دل میں بسا اور ہی کچھ ہے

دل میں تم، آنکھ میں تم، کعبہ میں تم، دیر میں تم　　تم جہاں چاہو چھپو، ہم تمہیں پہچان گئے ہیں

خورشید بھی اس نور کا مظہر ہے قمر بھی　　اے بے بصر و کچھ تمہیں آتا ہے نظر میں

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے　　کون جانے تجھے کہاں تو ہے

لاکھ پردوں میں ہے تو بے پردہ　　سو نشانوں پہ بے نشاں تو ہے

تو ہی خلوت میں تو ہی جلوت میں　　کہیں پنہاں کہیں عیاں تو ہے

نہیں تیرے سوا جہاں کوئی　　میزباں تو ہے میہماں تو ہے

جسم کہتا ہے جان ہے تو ہی　　جان کہتی ہے جان جاں تو ہے

(امیر مینائی، ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، جنوری ۱۹۱۰ء ص ۱-۱۰)

حواشی

(۱) ضیاء الدین احمد برنی، عظمت رفتہ، ص ۲۶۶-۲۶۷، ادارہ علم وفن کراچی، ۲۰۰۰ء۔ (۲) ایضاً، ص ۲۶۶۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، رمضان المبارک ۱۳۲۷ء، ص ۶۱-۶۲۔ (۵) ملا واحدی، تاثرات، ص ۴۶، مرتبہ حکیم محمد سعید، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۰ء۔ (۶) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، ذی الحجہ ۱۳۲۷ء، مطابق جنوری ۱۹۱۰ء، ص ۲۔ (۷) ایضاً، ص ۱۔

صولت ٹونکی: راجپوتانہ کے منفرد شاعر

ڈاکٹر معین الدین شاہین

دبستان ٹونک سے وابستہ جن شعرا و ادبا کو دنیائے شعر و ادب میں قابل احترام مقام و مرتبہ حاصل ہوا ان میں محمود الحسن صولتؔ ٹونکی کا نام نامی و اسم گرامی سر فہرست ہے، یہ مقام و مرتبہ حضرت صولت کو اس لیے حاصل ہوا کہ انہوں نے نہ صرف اپنے طور پر علمی و ادبی خدمات انجام دیں بلکہ ایک ایسا حلقہ بھی سرزمین ٹونک میں تیار کیا جس نے ادبی روایات کو آگے بڑھانے میں پیش رفت کرتے ہوئے عالمی سطح پر اپنی انفرادی پہچان قائم کی۔

صولت ٹونکی نے اردو و فارسی کی مروجہ متعدد ایسی اصناف میں شعری ادب پیش کیا جو دبستان ٹونک کا خاصہ رہی ہیں، مثلاً حمد، نعت، غزل، نظم، قطعہ، رباعی اور چار بیت وغیرہ، علاوہ ازیں روایت ٹونک سے ہٹ کر مناقب میں بھی سخنوری کے جوہر دکھائے، حمد، نعت اور منقبت جیسے اصناف سخن چونکہ مذہبی شاعری کے زمرے میں آتے ہیں، اس لیے صولت نے ان اصناف میں اعتدال اور احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا، اس ذیل میں سب سے قبل یہ چند حمدیہ اشعار ملاحظہ فرمالیجیے:

حیات و موت ہے بندوں کی تیرے قبضے میں — جلانے والا ہے تو، تو ہی مارنے والا
پکار غم کی سنے کون کس کی طاقت ہے — تجھی کو کیوں نہ پکارے، پکارنے والا
تم اب تو دیکھ چکے آزما کے صولتؔ کو — کسی طرح نہیں ہمت یہ ہارنے والا

اسی طرح ان کی نعتیہ تخلیقات بھی اپنی اثر پذیری اور بہ لحاظِ جوشِ عقیدت قابل تحسین ہیں، کہیں کہیں تو جوش عقیدت اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں احتیاط کے قدم پھسلتے نظر آتے ہیں مگر مجموعی حیثیت سے ان کا انداز نعت حب نبویؐ سے آشنا کرتا نظر آتا ہے، ذیل کے چند اشعار سے اس

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، سمراٹ پرتھوی راج چوہان گورنمنٹ کالج، اجمیر (راجستھان)۔

امر کی عکاسی ہوتی ہے:

جواب اپنا نہیں رکھتے جنابِ سرورِ عالمؐ خدائی لا نہیں سکتی جوابِ سرور عالم

پھر دل کو میرے غیرتِ فردوس بنادے لا بادِ صبا نکہتِ سلطان مدینہ

میں اور کہاں داورِ محشر کی حضوری کام آئی فقط نسبتِ سلطانِ مدینہ

ذرے کو بھلا مہرِ جہاں تاب سے نسبت صولتؔ کو سرِ مدحتِ سلطانِ مدینہ

اصلاً نہیں ہے اب مجھے جینے کی آرزو اب تو جِلا رہی ہے مدینے کی آرزو

حد سے زیادہ گنبدِ خضراء کی آرزو کعبے سے بھی سوا ہے مدینے کی آرزو

نسبت ہے مجھ کو اس شہِ عالی مقام سے لیتا ہے جس کا نام خدا احترام سے

مجھ سا ہے کون محرمِ اسرارِ مصطفیٰ دنیا میں ہوں میں اک گلِ گلزارِ مصطفیٰ

ظاہر ہیں تیری شکل سے انوارِ مصطفیٰ دنیا میں میری دید ہے دیدارِ مصطفیٰ

ہوئی نصیب جسے خاک پائے شاہِ عرب زمیں پہ ہوکے وہ صولتؔ فلک جہان ہوا

یہ رباعی بھی نعتیہ شاعری کے حوالے سے لائق توصیف ہے:

ہر قطرہ ہے پانی کا ثمر خلدِ بریں کا صدقہ ہے یہ صولتؔ بخدا سرورِ دیں کا

ہے نزع کے عالم میں مجھے راحتِ جنت ثمرہ ہے یقیناً یہ میرے حسنِ یقیں کا

مشہور ہے کہ صولت صاحب نے انفرادی طرز ادا کے ساتھ بہت سی منقبتیں لکھی ہیں لیکن صد افسوس کہ تلاش بسیار کے بعد راقم الحروف کو ان کی صرف ایک منقبت خواجہ غریب نواز کی مدح و ستائش میں دستیاب ہوئی، جس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

یہ میری مصیبت کی دیں گے گواہی یہ آنسو جو آنکھوں میں لایا ہوں خواجہ

فسانہ یہی ہیں مرے رنج و غم کا انہیں ساتھ لے کر میں آیا ہوں خواجہ

کہیں اور مجھ سا نہیں کوئی بے کس کروں کیا یہاں ہوں میں کس درجہ بے بس

یہ عالم ہے دنیا میں ہستی کا میری کہ جیسے فلک کا گرایا ہوں خواجہ

ہوں کمتر مگر ہے بڑی میری نسبت سکندر ہوں میں اپنی قسمت کا صولتؔ

کہ داغِ غلامیٔ آلِ محمدؐ ازل سے جبیں پر میں لایا ہوں خواجہ

میدان غزل گوئی میں صولت نے خوب جوہر دکھائے ہیں، جب وہ غزل کہتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بہاریں مسکرارہی ہیں اور فضائیں گنگنارہی ہیں، غزل کے شعر کا ایک ایک لفظ ان کے جذبات قلبیہ کی بھرپور عکاسی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، ان غزلوں سے وہ اساتذۂ سخن کی صف کے لائق ہونے کا بجا طور پر دعویٰ کرتے ہیں، دبستان راجپوتانہ کی اگر کوئی پہچان بنے گی تو اس میں بڑا حصہ صولت صاحب کی غزل گوئی کا یقیناً ہوگا، ذیل کے اشعار سے قارئین ہماری رائے کی تائید کریں گے۔

چلو یہ عمر فانی دے کے ہاتھوں ہاتھ لے آئیں — حیات جاودانی بٹ رہی ہے کوئے قاتل میں

جہاں انسان کو اعزازِ انسانی نہ حاصل ہو — نہ لے جائے خدا صولتؔ کسی کو ایسی محفل میں

یہ تم نے مسکرا کے حجابِ بہار میں — سب گل کھلائے ہیں چمن روزگار میں

کمبخت لازمی ہے محبت میں بدظنی — پیوست نوکِ خارِ خزاں ہے بہار میں

تو کوئی زحمت نہ کرائے چارہ گر میرے لیے — آپ درماں ہے مرا دردِ جگر میرے لیے

بام و درِ مطلع انوار نظر آتے ہیں — ان کے آنے کے سے آثار نظر آتے ہیں

آپ تو حضرتِ صولتؔ دمِ دیدارِ جمال — صورتِ نقش بہ دیوار نظر آتے ہیں

چھپا کے رکھتے تھے ہم جس قدر محبت کو — غضب تو دیکھو وہی آشکار ہو کے رہی

ان کا انداز شعر گوئی بڑی حد تک حسرت موہانیؔ، جگر مرادآبادیؔ جیسے متغزلین شعرا کے دوش بدوش نظر آتا ہے، ملاحظہ ہو:

کسی کروٹ تو چین آئے، کسی پہلو تو کل آئے — الٰہی کوئی تو صورت تسلی کی نکل آئے

یہ کس کی یاد نے لیں چٹکیاں دل میں مرے صولتؔ — یہ اک دم بیٹھے بیٹھے کیوں مرے آنسو نکل آئے

نگاہِ شوق تری پڑگئی ہے جس پر بھی — نہ دل سے دور کبھی اس کے اضطراب ہوا

وہ رخ زیبا سے جو اپنے الٹ دیتے نقاب — ہم شب تاریک میں عالم درخشاں دیکھتے

معمولی حسن والا جہاں میں نہیں ہے تو — لاکھوں میں جس کو ایک کہیں وہ حسیں ہے تو

وہ مسکرا کے دیکھ رہے ہیں مری طرف — ہے آج کائنات مرے اختیار میں

اللہ رے جمال و زہے تابشِ جمال — جس کی نگاہ تم پہ پڑی دنگ رہ گیا

نگاہِ لطف نہ کر، چشم ناز رہنے دے — یہ ساز باز مرے فتنہ ساز رہنے دے

رہے لبوں پہ تبسم بھی چشم قہر کے ساتھ　　رہینِ کشمکش سوز و ساز رہنے دے
یہ میرا حسن تصور بڑا مصور ہے　　خیال سے تری تصویر اتارنے والا
مجھ سے پہلے بھی کسی نے تمہیں چاہا تھا کبھی　　یہ بتادو تمہیں اغیار نے چاہا کب سے

صولت ٹونکی کے یہ اور دوسرے غزلیہ اشعار میں کلاسکیت اور روایت کی لہریں صاف نظر آتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان میں ایسا نیا پن بھی ہے جو جدیدیت کی بنیاد فراہم کرتا ہے، یہی رنگ اس وقت زیادہ کھل جاتا ہے جب وہ حب وطن کی وادی میں نغمہ سرا رہتے ہیں۔ دیکھیے:

یہ فیصلا دلوں میں ہے کامل یقین کا　　مٹنا وطن پہ اپنے بنانا ہے دین کا
سو بار بھی دلوں سے گزر جائے موج خوں　　چھوڑیں گے ایک چپہ نہ اپنی زمین کا
بھارت میں اس کا آنا ہوا تو یہ دیکھنا　　دنیا سے نام تک بھی مٹادیں گے چین کا
دشمن سے دوستی کی تمنا فضول ہے　　بندر کے آگے یہ تو بجانا ہے بین کا

☆☆☆

موزوں نہیں ہے یہ تو سرمو مقابلہ　　شاہیں سے کرنے آیا ہے اُلّو مقابلہ
بڑھ کر مقابلہ ہو کہ ہٹ کر مقابلہ　　ہو خواہ دوبدو کہ پلٹ کر مقابلہ
کی دوستی کے پردے میں اس نے تو دشمنی　　کرنا پڑے گا چین سے ڈٹ کر مقابلہ

صولت مرحوم اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ حب الوطنی اور قومی یکجہتی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے بطور مثال کرشن جی پر جو اشعار تخلیق کیے ان کے حوالے سے اس پہلو کی مزید وضاحت ہوتی ہے:

ہردل میں گر ہزار تمہارے کرشن ہیں　　ہراک یہ جانتا ہے ہمارے کرشن ہیں
آنکھوں کا نور، دل کا سکوں، روح کی نشاط　　میرے لیے تو سب مرے پیارے کرشن ہیں
میں ہی نہیں ہوں ان کی محبت میں مبتلا　　سارے جہاں کی آنکھ کے تارے کرشن ہیں

ہندوستان کی تحریک آزادی میں ہمارے بزرگوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں لیکن اقتدار کا انعام شومی قسمت سے ایسوں کے حصہ میں آیا جنہوں نے تحریک آزادی کی راہ میں ایک قدم بھی نہیں اٹھایا، حضرت صولت نے اس دردو کرب کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ:

خوب آزادی ملی، اچھے ہوئے آزاد ہم پڑ گئے جینے کے لالے ہو گئے برباد ہم
ہائے وہ ارزانی اجناس و اشیاء اب کہاں عمر بھر بھگتا کریں یہ قید کی میعاد ہم

صولت صاحب کے عہد کے اکثر شعرا و ادبا سے گہرے تعلقات تھے، ان کے احباب میں حفیظ جالندھریؔ، شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی، کنورؔ مہندر سنگھ، جگرؔ مرادآبادی، شعریؔ بھوپالی، علامہ انورؔ صابری، علامہ ماہر القادریؔ، روشؔ صدیقی، ساغرؔ نظامی اور منظرؔ صدیقی، حضرت سیمابؔ اکبرآبادی اور فراقؔ گورکھپوری وغیرہ کے اسما قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے بیشتر مشاعروں اور شعری نشستوں میں صولت صاحب کو قدر و منزلت سے نوازا، راجستھانی اردو ادب میں تو ان کا ذکر خصوصیت سے ہونا ہی تھا، جوہرؔ ٹونکی کے مندرجہ ذیل اشعار میں اگرچہ صولت صاحب کی شخصیت اور ان کے مزاج کے بیان میں ایسے الفاظ آ گئے ہیں جو شاید ان کی شعری شخصیت کے مناسب نہیں مگر شخصی بے اعتدالیوں کے ذکر میں ان کی شاعرانہ اہمیت کا بہترین اظہار بھی ہوا ہے:

گلستانِ شاعری کا وہ چہکتا عندلیب وہ نوا سنج سخن، وہ صولتؔ رنگیں بیاں
نکتہ رس، غائر نظر، بیدار اور روشن دماغ صاف گو، باریک بیں، بے خوف نقاد زباں
مثل گل، نازک مزاج و تند خو، شکل نگار لحظہ لحظہ مہربان و دم بہ دم نامہرباں
زود رنج، حساس فطرت، سخت مغلوب الغضب اس کی وہ غصے کی عادت الحفیظ و الاماں
جیسے چنگاری پڑے اک تودۂ بارود میں جیسے گر جائے خس و خاشاک پر برق تپاں
وہ ہمیشہ ہی رہا ہے صورت زیبا پرست وہ ہے دیرینہ قتیل خنجرِ نازِ بتاں
اس کو در پردہ کیا برباد ان احباب نے آہ جو تھے کم نگاہ و ناکس و ناقدرداں
باوجود اس کے ہے وہ فن سخن میں بے نظیر ایسے شاعر کم جنیں گی مادرِ ہندوستاں

صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''حضرت صولت کی یاد میں'' بجا طور پر یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

''حضرت صولت ایک کہنہ مشق شاعر، مسلم الثبوت استاد اور قادر الکلام سخنور تھے جن کے کلام میں شاعرانہ ترنم اور سلامت مذاق کے ساتھ ساتھ ایک تغزل، ایک وجدانی کیفیت اور رومان افروز تاثر ملتا ہے، انہوں نے واقعی غزل کہی جس کی وادی ایمن

میں بہت طبع آزمائی کی گئی ہے لیکن ہمارے صولت صاحب کے فکر رنگین اور لطافت زبان نے اس نقش کہن میں کہیں عشق سرمدی کے رنگ بھر دیے ہیں تو کبھی عشق رسول صلعم کے نقوش ثبوت کر دیے ہیں اور کبھی معرفت و حقیقت کے رمز شناس بن کر فلسفیانہ بصیرت کی گل افشانیاں کی ہیں اور کہیں کہیں حسن و عشق کی واردات اور معاملہ بندیوں میں الجھ کر بھی اپنے فیضان شعری اور عرفان حقیقی کی جلوہ نمائی کا ساتھ نہیں چھوڑا''۔

مولانا منظور الحسن برکاتی مرحوم کی حسب ذیل تحریر بھی صولت شناسی کی بخوبی وضاحت کرتی ہے، برکاتی صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے:

''صولت صاحب اس دور جدید میں بھی سادگی کی تمام پرانی قدروں کو بڑی مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے، ان کی چال ڈھال، رفتار و گفتار، وضع قطع اور رہن سہن، سب میں انوار قدامت رخشندہ تھے، وہ بڑی سیدھی سادی زندگی گزارتے تھے، رکھ رکھاؤ، بود و باش اور لباس کے اعتبار سے اب سے سو سال پہلے کی چلتی پھرتی تصویر نظر آتے تھے، اکثر ایک ہاتھ میں ان کے چھوٹی سی چھڑی یا لکڑی اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تھیلا ہوتا تھا، تھیلے میں ڈبیہ، بٹوہ، چشمے کے گھر کے علاوہ تازہ آمدہ خطوط ہوا کرتے تھے، وہ سادہ لباس پہنتے تھے، انہیں ''ذوق آرائش سر و دستار'' مطلق نہ تھا، معمولی لٹھے کا شرعی پاجامہ، ململ کا کرتا اور سر پر اکثر تن زیب کی دو پلڑی لکھنوی طرز کی ٹوپیاں پہنا کرتے تھے''۔

پروفیسر پریم شنکر شری واستو نے جب کتاب ''راجستھان کے موجودہ اردو شاعر'' مرتب کی تو بڑے وثوق کے ساتھ صولت کے متعلق لکھ دیا کہ:

''جہاں کہیں بھی ٹونک کے شعرا کا ذکر ہوتا ہے تو اختر شیرانی کے بعد استاد صولت کا ہی نام زبان پر آتا ہے، ٹونک، شاعری، صولت، ان تینوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا''۔

شری واستو صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

''صولت صاحب کی طبیعت بے انتہا حسن پرست تھی، یہی وجہ ہے کہ حسن و عشق کی شاعری آپ کی روح رواں ہے، استاد صولت نے اب تک سیکڑوں غزلیں اور

> ہزارہا شعر کہہ ڈالے ہوں گے، ان سب کو اگر یکجا کیا جائے تو کئی دیوان تیار ہو جائیں لیکن چونکہ آپ کی طبیعت میں ٹونک کے نوابوں کی سی دریا دلی ہے، آپ نے غزلیں کہیں اور اپنے عزیز و اقارب میں بانٹ دیں، سیکڑوں غزلیں اسی طرح دوسروں کی پونجی بن چکی ہیں، ٹونک کے دورے میں مجھے بتایا گیا کہ صولت صاحب غزل لکھ کر ایک خالی مٹی کے گھڑے میں ڈال دیتے ہیں، جب کسی حضرت نے صولت صاحب سے آ کر کہا ''استاد آج فلاں جگہ مشاعرہ ہے ایک غزل تو ہمیں بھی عنایت ہو جائے'' اور صولت نے مٹکے میں ہاتھ ڈالا اور فوراً غزل نکال کر دے دی''۔

مرحوم راہی شہابی نے صولت سے متعلق نپے تلے انداز میں سہی لیکن بڑے پتے کی بات تحریر کی ہے:

صولت صاحب ایک ایسی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے، بہت ہی دبلے پتلے مگر اپنی وجاہت اور علم کے اعتبار سے ہزاروں پر بھاری فی البدیہہ شعر کہنے اور شعر کے معائب و محاسن پرکھنے میں کمال حاصل تھا، کراچی سے ماہر القادری صاحب ٹونک تشریف لائے، مدرسہ خلیلیہ میں مشاعرہ ہوا، نظامت میرے سپرد کی گئی، میں نے اخیر میں صولت صاحب سے درخواست کی، وہ ٹالنے لگے، ماہؔر صاحب نے میرے کان میں کہا، راہی صاحب ہم کب کب آئیں گے، خدارا صولت صاحب سے کچھ سنوایئے، میں نے صولت صاحب سے کہا میری گزارش تو آپ نے منظور نہیں کی مگر ٹونک والوں کی مہمان نوازی مشہور ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ ماہر صاحب کی فرمائش کو نظر انداز نہیں کریں گے، صولت صاحب مجبور ہو گئے اور انھوں نے مسلسل تین غزلیں ارشاد فرمائیں، ان کے اس شعر پر ماہر صاحب جھوم اٹھے تھے ؎

چلو ایسے میں چل کے آج ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں حیات جاودانی بٹ رہی ہے کوئے قاتل میں

صولت اپنے دوست، احباب اور اقربا کو بے حد عزیز رکھتے تھے، اس لیے ان کی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کے متعلق برجستہ اشعار کہہ دیا کرتے تھے، جگؔر مرادآبادی سے متعلق ان کے یہ دو اشعار قابل ذکر ہیں:

جگر اور صولتؔ کا اللہ حافظ گلے مل کے باہم جدا ہو رہے ہیں

ناتوانی سے مری یہ بار اٹھ سکتا نہیں کوہ ہے صولت غم مرگ جگر میرے لیے

یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ صولت ٹونکی کی سجع گوئی اردو کی ادبی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، ٹونک کے اکثر حضرات اوران کے متعلقین کے بابت جو سجعے تخلیق کیے انہیں یکجا کیا جائے تو ایک مجموعہ مرتب ہوسکتا ہے، بقول منظور الحسن برکاتی ۱۳۱/اکتوبر ۱۹۶۲ء کو مولانا قاضی الاسلام کے چھوٹے بھائی سید افضل الاسلام کے فرزند انوار میاں کی تقریب بسم اللہ خوانی کے موقع پر صولت نے یہ سجع تخلیق کیا:

یہ تبریک دیں جاودانی مبارک مبارک یہ تسمیہ خوانی مبارک

ہے انوار الاسلام یہ زورِ بہجت یہ علمی تجھے شادمانی مبارک

☆☆☆

ہر مسلمان کو جہاں میں بس یہ حکم عام ہے شرطِ دینداری فقط پابندی احکام ہے

اطلب العلم ہے فرمان رسول بطحا جستجوئے علم واجب سب پہ صبح و شام ہے

کر عمل انوار الاسلام اس حدیث پاک پر تسمیہ خوانی، بحکم قاضی الاسلام ہے

دل سے ہے منظور صولتؔ کو یہ تقریب حسن تسمیہ خوانی کی شرکت افضل الاسلام ہے

مولانا حکیم عبدالقوی صدیقی صاحب کے گھر دختر نیک اختر بنام حبیبہ کی پیدائش پر صولت صاحب نے اس طرح سجع پیش کیا:

ہو مبارک اے میاں عبدالقوی بنت یہ اللہ نے جو تجھ کو دی

والدِ امِ حبیبہ شاد باش آمد بنت سعیدہ کی خوشی

دارالعلوم خلیلیہ ٹونک کے طلبہ کی جانب سے ایک رسالہ بانی دارالعلوم مولانا حکیم سید برکات احمد صاحب کے متعلق نکالا گیا تو صولت صاحب نے یہ اشعار کہے:

وہ فخر دہر، وہ علامۂ ستودہ صفات کہ جس کے فیض کو ہے تاابد قرار و ثبات

جناب مولوی برکات احمد قبلہ جہان علم کے گویا تھے قبلۂ حاجات

یہ ماہنامہ مبارک انہیں کے نام سے ہے اسی کو کہتے ہیں سب اہل علم ''البرکات''

دعا ہے یہ رہے برکات کا چمن شاداب نصیب ہو اسے صولتؔ مدام تازہ حیات

جب اس دارالعلوم میں شعبۂ طب کا قیام عمل میں آیا تب بھی صولت صاحب نے اظہار مسرت کے طور پر کہا:

مخلوق پڑھنے آئے یہاں شام و روم کی ایسی جہاں میں شان ہو دارالعلوم کی

درجہ نیا جو طبّیہ تعلیم کا کھلا　　یہ سمّیت مٹائے گا بادِ سموم کی
طالب ہر ایک علم کا بن جائے گا حکیم　　مٹ جائے گی وبا ہی جہول و ظلوم کی
جاری رہے یہ چشمۂ برکات احمدی　　صولتؔ ہو اس کے ذروں میں تابش نجوم کی

مولانا منظور الحسن برکاتی مرحوم کے دولت کدہ ''شفا منزل'' کے متعلق صولت صاحب کا یہ شعر بھی خوب ہے:

جس کو تم کہتے ہو شفا منزل　　مرکز علم ہے یہ اے صولتؔ

مولانا منظور صاحب کے سعادت مند شاگرد ریاض الحسن کے جذبۂ خدمت سے متاثر ہو کر صولت نے یہ سجع پیش کیا:

یوں ہی تا ابد زیرِ چرخِ کہن　　مہکتا رہے گا ریاض الحسن

صولت صاحب صاحبزادہ شوکت علی خان کی قابلیت، صلاحیت، شرافت اور علمیت سے از حد متاثر تھے، شوکت صاحب سے متعلق صولت کے چند سجعے ملاحظہ فرمائیں:

تم بھی صولتؔ کہو شوکتؔ سے بقول غالبؔ　　مجھ کو تجھ سے جو ارادت ہے تو کس بات سے ہے

''قصر علم'' اور شوکت صاحب کی مناسبت سے یہ سجع بھی فنکاری کی عمدہ مثال ہے:

بابِ دیار علم کہا ہے حضور نے　　دراصل قصر علم کی شوکت علی سے ہے

اسی ذیل میں صولت مرحوم کے مندرجہ ذیل سجعے بھی کمالِ فن کی عمدہ نظیر پیش کرتے ہیں:

رہتی دنیا میرے شوکت علی تیرے سر پر　　دستِ آل شہ ابرار مبارک باشد
نسبتِ حیدر کرار مبارک باشد

میرا شوکت پری جمال تو ہے　　اس کا مجھے ہر دم خیال تو ہے
آرہا ہے وہ یاد صولتؔ کو　　بھیج پروردگار شوکت کو

اور آخر میں قاضی الاسلام اور مولانا منظور الحسن برکاتی سے متعلق یہ مشترک سجع بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

تا ابد قائم رہیں یارب تہہ چرخِ کہن　　قاضی الاسلام صاحب اور منظور الحسن

صولت ٹونکی تادم آخر راجستھان کی سنگلاخ اور ریتیلی زمین پر شعر و سخن کے پھول کھلاتے رہے میں مصروف رہے اور ایک دن وہ بھی آ گیا جس کے متعلق خود صولت صاحب نے فرمایا تھا:

ہم نہ تھے کل کی بات ہے یہ بھی　　ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

☆☆☆

عہد اکبر میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب

جناب الطاف حسین

عہد اکبر اور مشترکہ تہذیب اپنے آپ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔عہد اکبر میں تمام مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے تہذیب وتمدن کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔اس سے پہلے کے مسلم حکمرانوں کے عہد میں مشترکہ تہذیب کو فروغ حاصل نہیں ہوا،اس لیے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مغلیہ دور میں مشترکہ تہذیب کی شعوری اور دانستہ کاوشیں سب سے زیادہ ملتی ہیں، فارسی زبان کے ساتھ مشترکہ تہذیب کا ذکر لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے، ڈاکٹر کامل قریشی نے اپنی کتاب ''اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب'' میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے قول کو نقل کیا ہے:

> ''مغلوں کے زمانے میں جو نخل بندی اور پیوندکاری کے تجربات سے گزر چکے تھے یہ تہذیبی نقش اور زیادہ حسین ہوگیا، انھوں نے ترکوں کی سخت کوشی، فراخ دلی اور خودداری میں ایرانیوں کی لطافت اور شائستگی اور مساوات اور اخلاقی ضبط کی قلم لگا کر ہندوستان کی گنگا جمنا تہذیب کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ ایک تناور درخت بن گیا اور اس کی جڑیں جمالیاتی شعور اور تصوف کی انسان دوستی تک پہنچ گئیں، اس زمانے کی عمارتیں، تصویریں، تصوف کی تحریکیں اور شعروشاعری کے کارنامے سب اس امتزاج اور اتحاد پسندی کے آئینہ دار ہیں''۔(۱)

کشورِ ہند کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ اس کی کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا جلوہ نظر آتا ہے۔

بادشاہ اکبر نے اپنی حکومت میں سبھی ایسے فرمانوں کو جو مذہبی بنیاد پر امتیازی سلوک کرتے تھے،

جواہرلال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۷۔

ختم کردیا اور مشترکہ تہذیب کے رہن سہن پر زور دیا، اس نے رعایا کے مختلف طبقوں اور فرقوں کو ایک جگہ جوڑنے کی کاوشیں کیں، قومی تہذیب کا حصار بھی بادشاہ اکبر کے ہاتھوں ہوا، یوں ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا دائرہ اس طرح پھیلا جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

بادشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں بہت سارے ترجمے ہوئے جیسے رامائن، مہابھارت اور اتھروید کا فارسی ترجمہ ہوا، اس کے بعد بہت سارے علما و فضلا نے فارسی سے سنسکرت اور سنسکرت سے فارسی میں ترجمے کیے، اس طرح لوگوں نے ایک دوسرے کے ادب کو پڑھا، ایک دوسرے کے آداب و رسوم سے آشنائی حاصل کی، اکبر کا یہ کام بھی مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

اکبر بادشاہ مذہبی رواداری میں بھی پیش پیش رہے، اکبر کی مشہور ترین کاوشوں سے ہندو ایرانی تہذیب کو کافی فروغ ملا، بادشاہ اکبر مذہبی تفرقے کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے، اکبر اپنے دادا کی نصیحت پر عمل پیرا ہوا اور اپنے بیٹے جہانگیر کو بھی اس کی وصیت کی کہ دماغ کو مذہبی تعصب سے متاثر نہیں ہونے دینا چاہیے اور ہر ایک کے مذہبی رسم و رواج کا پورا خیال رکھنا چاہیے، اس طرح رشتۂ یگانگت میں مضبوطی اور مشترکہ تہذیب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، سب کو شہری حقوق سے سرفراز کیا، اس کی سب سے واضح مثال مغل حکمرانوں کا ہندوؤں میں شادیوں کا رواج ہے جس سے ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔

ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی بنیاد دراصل مسلمانوں کی آمد سے ہی شروع ہوگئی تھی، محمد بن قاسم آٹھویں صدی میں بہت سارے ایرانی لوگوں کے ساتھ ہندوستان کے علاقہ سندھ میں وارد ہوئے، اس کے بعد محمود غزنوی نے گیارہویں صدی میں ہندوستان پر حملہ کیا اور مشترکہ ہند و ایرانی تہذیب میں اضافہ کیا، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب غلام خاندان کے حکمرانوں کے بعد قطب الدین ایبک، شمس الدین جیسے بادشاہوں کے دور میں ارتقائی منزلوں سے گزرتی رہی، مختلف طبقوں کی روایات کا حصہ بنی اور بالآخر مغلیہ سلطنت ۱۵۲۶ء میں بابر کے ہاتھوں عمل میں آئی، مغل دور کے سبھی بادشاہوں نے مشترکہ تہذیب میں اہم رول ادا کیا، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب جو دراصل بہت پہلے سے چلی آرہی تھی، مغل بادشاہوں نے اسے اور مضبوط کیا، دراصل عہد مغلیہ زمانے کے حالات کو سامنے رکھ کر دو حصوں میں آتا ہے، اول دورِ شباب اور دوم دورِ انحطاط، سال ۱۵۲۶ء سے لے کر سال ۱۷۰۷ء تک شباب کا زمانہ تھا اور سال ۱۷۰۷ء سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک دورِ انحطاط، برطانوی تسلط

کی وجہ سے مغلیہ سلطنت میں وہ بات نہ رہی جو بادشاہ بابر سے لے کر اورنگ زیب تک تھی۔

اگر دیکھا جائے تو خاص کر بادشاہ اکبر کا دور استحکام اور امن وامان کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس دور میں زبان وادب کو کافی فروغ حاصل ہوا، بیرم خاں انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ بہت بڑے عالم وشاعر بھی تھے، عرفی شیرازی اکبر کے دور میں ایران سے ہندوستان آیا اور دربارِ اکبری کو گرمایا، ابوالفضل نے ''اکبرنامہ'' اور ''آئینِ اکبری'' لکھ کر اکبر کی تاریخ کو ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید بنادیا، فیضی بھی بادشاہ اکبر کا محبوب شاعر اور ملک الشعرا تھا، نظیری بھی اکبر کے دربار سے قربت رکھتا تھا، بادشاہ بابر وہمایوں کو زیادہ وقت علمی وادبی کارناموں میں نہ ملا لیکن اگر ہم دورِ اکبر کو نظر میں رکھیں تو واضح ہوجاتا ہے کہ یہ دور تاریخی اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، خاص کر بادشاہ اکبر کے دور میں شاعروں اور ادیبوں کو انعامات واعزازات سے نوازا گیا تھا، بادشاہ اکبر نے ''دارالترجمہ'' میر جمال الدین حسین کی نگرانی میں قائم کیا، جس میں بہت سارے علما وادبا جیسے ملا شیری، عبدالقادر بدایونی اور نقیب خان متعین کیے گئے، ان تمام علما وفضلا نے ترجمہ کرکے علمی وادبی میدان کو وسیع کیا جیسے ابوالفضل کی ''مہابھارت وعیار دانش''، بدایونی کی ''رامائن'' اور ''سنگھاسن بتیسی''، اکبر کے جانشینوں نے اس کی پیروی ضرور کی مگر اکبر کے دور کی طرح وہ زور وشور نہ رہا، ایسا کہنا بھی مناسب نہیں کہ اکبر کے بعد سنسکرت اور ہندی ادب کا ارتقا رک گیا، اورنگ زیب کا بھائی داراشکوہ سنسکرت کا مربی اور علم وفن کا سرپرست رہا، اس نے اپنشد کا ترجمہ ''سرا کبر'' کے عنوان سے کیا۔

مشترکہ تہذیب خاص کر ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے، ہمارا ملک قدیم زمانے سے نہ صرف عالمی سطح کا مرکز رہا بلکہ ہندوستان میں وہ سب ذرائع موجود تھے جن سے تہذیب میں ترقی کرنے والوں میں ان کا پہلا نمبر تھا، ہندوستان زمانہ قدیم سے ہی ''دارالتہذیب'' کے نام سے جانا جاتا ہے، اس لیے دوسرے ملکوں کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ملتا ہے، یہاں کی تہذیب میں ایرانی تہذیب وتمدن کا اثر سب سے زیادہ پایا جاتا ہے، تہذیب کی رنگارنگ لہریں بہت پرانے زمانے سے اس ملک کی مشترکہ تہذیب کو فروغ دیے ہوئے ہے، ان رنگارنگ لہروں میں بادشاہ اکبر کی مشترکہ تہذیب کی لہر ہمارے لیے ایک خوبصورت پیغام کی مثال ہے، انہوں نے جس طرح مختلف فرقوں کو جوڑنے کی کوششیں کیں وہ اکبر بادشاہ جیسے دوراندیش کا ہی کام تھا، اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی بھی حکومت کی بنیاد اس وقت تک مضبوط نہیں ہوتی جب تک اس کا انتظام غریب رعایا کے دل میں گھر نہ کرے، اکبر بادشاہ نے اس کام میں ہمیشہ پہل کی،

اکبر کے زمانے میں سبھی فرقوں نے ایک دوسرے کی زبانوں کو سیکھا اور مشترکہ تہذیب وتمدن کو فروغ دیا۔

ہمارا ملک قدیم مشرقی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے، اگر دیکھا جائے تو پوری دنیا میں زمانہ قدیم میں تہذیب کے دو مرکزی دھارے رہے ہیں، ایک گنگا جمنا کے دوآبہ میں دوسرا یونان وروم میں، ہماری تہذیب دراصل ایشیا تک پھیلی اور یونان وروم کی تہذیب نے پورے یورپ کو سرفراز کیا، اغلب دونوں دھارائیں ہندوستان میں ہی آکر ملتی ہیں، ہماری تہذیب میں دراصل کئی رنگوں کا میل ہے، اکبر کے دور کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں تھی، اکبر بادشاہ مذہبی رواداری کو پسند کرتا تھا حقیقت دراصل یہ ہے کہ ہندو مسلم یکجہتی میں بادشاہ اکبر کا اہم رول رہا ہے جسے ہندوستانی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

بادشاہ اکبر نے سال ۱۵۷۵ء فتح پور سیکری میں عبادت خانہ بنوایا جس میں ہر مذہب کے علما و فضلا بحث کیا کرتے تھے، اس کے علاوہ اکبر نے ایک مذہب "دینِ الٰہی" یا "توحیدِ الٰہی" بنایا، اس کے ذریعے بادشاہ اکبر اپنی رعایا کو وفادار اور ملک وقوم کا ذمے دار شہری بنانا چاہتا تھا، اکبر نے مشترکہ تہذیب کو سامنے رکھ کر سیکولر پالیسی اختیار کی۔

مغلیہ سلطنت میں عورتوں نے بھی علم وادب اور فن وثقافت کے جوہر دکھائے، ان میں کئی ایک نے امور حکومت کو بھی بخوبی نبھایا جیسے اکبر اعظم کی آیا "ماہم انگہ" ۱۵۶۴ء تا ۱۵۶۰ء تک حکمرانی کی، اس طرح آشکار ہوجاتا ہے کہ اکبر اعظم نے سب کو برابری کے حقوق دیے، سبھی مذاہب کو برابر رکھا، قرآن مجید میں واضح ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔

"لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" (مذہب کے معاملے میں کسی سے زبردستی نہیں)۔

"لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ" (تمہارا مذہب تمہارے لیے اور ہمارا مذہب ہمارے لیے)۔

اکبر بادشاہ نے حکومت کی بنیاد اس طرح ڈالی کہ قوموں اور مذہبوں میں آپسی فساد ختم ہوجائیں، اکبر کے ان خیالات اور ان تمام اصولوں کو اس کے قابل اعتماد وزیر ابوالفضل نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے جو کشمیر میں کسی مندر کی دیوار پر کندہ ہیں، جس کا بشمبھر ناتھ پانڈے نے اپنی کتاب "ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات" میں کیا ہے:

"اے الٰہی جس گھر کو دیکھتا ہوں اس میں تیرے کھوجنے والے ہیں اور جس زبان کو سنتا ہوں اس میں تیرا ہی چرچا ہے، کفر اور اسلام تیرے ہی راستے پر دوڑتے ہیں اور کہتے

ہیں تو ایک ہے کوئی تیرا ساجی نہیں، مسجد ہے تو اس میں تیرا نعرۂ قدوس بلند ہوتا ہے اور گرجا ہے تو تیرے ہی پریم میں گھنٹے بجتے ہیں کبھی میں بت خانے میں بیٹھ کر تیری ہی عبادت کرتا ہوں، کبھی مسجد میں یعنی تجھے ہی گھر گھر ڈھونڈتا ہوں، جو تیرے خصوصی لوگ ہیں انہیں نہ کفر سے مطلب ہے اور نہ اسلام سے کیونکہ ان دونوں کے لیے تیری قبولیت کے پردے میں کوئی جگہ نہیں ہے، کفر کافر کے لیے اور دین دیندار کے لیے''۔(۲)

بادشاہ اکبر مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ روادار رہے، اکبر کی یہ چاہت تھی کہ ایک تمدن کو دوسرے تمدن، ایک زبان کو دوسری زبان، ایک قوم کو دوسری قوم سے، ایک ریاست کو دوسری ریاست سے اور تہذیب کو دوسری تہذیب سے ملادیا جائے۔

اکبر بادشاہ نے ہر قسم کی فرقہ وارانہ روایات کو کم کیا اور امن وامان قائم کیا، اس لیے اکبر نے اپنی مذہبی پالیسی کو ''صلح کل'' کی بنیاد پر قائم کیا، اکبر اور اس کا نظریہ بادشاہت اس کے ایک خط سے واضح ہو جاتا ہے جو اس نے شاہ ایران کو لکھا، محمود علی نے اپنی کتاب ''عہد وسطیٰ میں مشترکہ تمدن اور قومی یکجہتی'' میں ابوالفضل کے اکبر نامہ کے حوالے سے اس خط کو یوں نقل کیا ہے:

''نوع انسان جو خدا کی مقدس امانت اور خزانہ ہے اسے شفقت کی نظر سے دیکھنا چاہیے، خدا کے رحم وکرم کا فیضان تمام ہی انسانوں کے لیے عام ہے، لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ ''صلح کل'' کے بہار کے زمانے کے پھولوں کے باغ میں داخل ہونے کی ہر امکان کوشش کرے خدائے لم یزل تمام ہی انسانوں کے لیے سرچشمۂ لطف وکرم ہے، اس لیے بادشاہوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس اصولوں کو نظر انداز کریں، کیونکہ وہ سایۂ خداوندی ہوتے ہیں''۔(۳)

اس طرح صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو دنیا کی تہذیب کے سامنے ایک انمول نمونہ پیش کیا ہے۔

حواشی

(۱) کامل قریشی، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۔ (۲) بشمبھر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات، پٹنہ، خدابخش خاں اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۴ء۔ ص ۶۔ (۳) محمود علی، عہد وسطیٰ میں مشترکہ تمدن اور قومی یکجہتی، دہلی، الہلال بک ڈپو، ۱۹۹۹ء۔ ص ۱۰۵۔۱۰۶۔

اخبار علمیہ

”مریخ پر پہلا عرب خلائی مشن“

مریخ پر بھیجے جانے والے پہلے عرب خلائی مشن کی تیاری عروج پر ہے۔اس مشن کے لیے خلائی جہاز میں ایندھن بھرنے کا کام اگلے ہفتہ سے شروع ہوگا۔مریخ اوراس کے مدار تک پہنچنے میں ۳۰۸ ملین میل کا سفر تقریباً سات ماہ میں طے ہوگا۔اس خلائی مشن کا مقصد مریخ اوراس کی آب وہوا اور ماحول کے بارے میں اہم اورضروری معلومات جمع کرنا ہے۔یہ خلائی روبوٹک جہاز مریخ کے گرد پورے ۶۸۷ دن چکر لگائے گا۔ایک چکر میں ۵۵ گھنٹے لگیں گے۔اس مشن کی سربراہ سارہ الامیری نے کہا کہ اس منصوبے سے عرب نوجوانوں کو خلائی انجینئرنگ کے شعبہ میں دلچسپی اورترغیب ملے گی۔ جاپانی راکٹ سے چلنے والے اس خلائی جہاز میں تین طرح کے سنسر نصب ہیں جو مریخ کے پیچیدہ ماحول کا جائزہ لیں گے۔ہائی ریزولیوشن ملٹی بینڈ کیمرہ بھی اس میں شامل ہے جواس سیارہ کی دھول اور اوزون کی پیمائش کرے گا،اس کے علاوہ سیارہ کی فضااورآکسیجن اور ہائیڈروجن کی سطح کی پیمائش کے آلے بھی لگے ہوئے ہیں۔محترمہ الامیری کے بیان کے مطابق اس تحقیق کا ایک مرکز یہ بھی ہوگا کہ پانی کے لیے یہ دوعناصر کس طرح اس سیارے سے ختم ہورہے ہیں ۔ برطانیہ کے سائنس میوزیم گروپ کے ڈائریکٹرسرای این بلیچفورڈ نے خاص طور سے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ اس سے قبل تمام خلائی مشن نے ارضیات پر توجہ مرکوز کی تھی لیکن یہ خلائی جہاز مریخ کی آب وہوا کی سب سے جامع تصویر اور معلومات مہیا کرے گا۔متحدہ عرب امارات میں خلائی سفر کا اس سے پہلے بھی ریکارڈ موجود ہے اوراس نے اپنے ایک خلاباز کو بین الاقوامی خلائی اسٹیشن بھیجا ہوا ہے۔رپورٹ میں اس بات کا انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ خلا میں جانے والے سب سے پہلے عرب سعودی عرب کے شہزادہ سلطان بن سلمان آل سعود تھے جنہوں نے ۱۹۸۵ء میں امریکی خلائی شٹل پر اڑان بھری تھی لیکن یہ بالکل مختلف مشن ہے۔واضح رہے کہ یہ خلائی جہاز کولوراڈو میں بنایا گیااور پھر جاپان بھیج دیا گیا، جہاں اس کے تمام انجینئرس کو کرونا کی وجہ سے فوری طور پر قرنطینہ میں جانا پڑا۔ برطانیہ کی اوپن یونیورسٹی سے وابستہ پروفیسر مونیکا گریڈی کا خیال ہے کہ اس مشن سے خلائی صنعت میں ایک بڑی کامیابی کا امکان ہے۔ یہ مریخ کی کھوج کے لیے ایک حقیقی پیش قدمی ہے۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی خلائی کمپنی اور

ناسا کے علاوہ دوسری قومیں بھی وہاں جاسکتی ہیں۔اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ مریخ کے مشن کی ناکامیوں کی لمبی تاریخ ہے لیکن امید ہے کہ یہ مشن کامیاب ہوگا۔(بی بی سی اردو نیوز،۹ جون ۲۰۲۰ء)

’’زمین جیسے ۶۰۰ کروڑ سیاروں کا امکان‘‘

ناسا کی ’’کیپلر۔۲‘‘ خلائی دوربین سے حاصل شدہ معلومات کا تفصیلی جائزہ لے کر ماہرین فلکیات نے تخمینہ لگایا ہے کہ صرف ’’ملکی وے کہکشاں‘‘ میں سورج جیسے ہر ۵ ستاروں میں سے ایک کے گرد زمین جیسا کوئی ایک ستارہ موجود ہوسکتا ہے۔یعنی ہماری ایک کہکشاں ہی میں زمین جیسے سیاروں کی تعداد ۶/ارب ہوسکتی ہے۔واضح رہے کہ ناسا نے ۲۰۰۹ء میں دوسرے ستاروں کے گرد سیاروں کی تلاش کے لیے ’’کیپلر‘‘ نامی دوربین خلا میں بھیجی تھی جو ۲۰۱۳ء میں خراب ہوگئی۔۲۰۱۴ء میں اس کی جگہ اس سے زیادہ طاقتور اور حساس ’’کیپلر۔۲‘‘ خلا میں بھیجی گئی۔۲۰۱۸ء میں وہ بھی خراب ہوچکی تھی لیکن اس دوران ۵ لاکھ ۳۰ ہزار ۵۰۶ ستاروں کا مطالعہ کرنے کے علاوہ دوسرے ستاروں کے گرد گھومتے ہوئے ۲ ہزار ۶۶۲ ستاروں کا سراغ بھی لگا چکی تھی۔اس چار سال کے عرصہ میں اس کے توسط سے اتنا زیادہ ڈیٹا حاصل ہوا کہ ماہرین اس کے تجربے اور نت نئی دریافتوں کے اعلانات میں مصرف ہیں۔تازہ تخمینہ بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔یہ تخمینہ نوجوان طالبہ مشیل کیونیموٹو نے ڈاکٹر جیمی میتھیوز کے زیر نگرانی لگایا ہے جو یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا میں شعبہ طبعیات وفلکیات کے پروفیسر ہیں۔سائنس دانوں کے مطابق ’’ملکی وے کہکشاں‘‘ میں ویسے تو ستاروں کی تعداد ۲ سو ارب کے قریب ہوسکتی ہے لیکن ان میں تقریباً ۳۰/ارب ستارے ساخت اور عمر کے لحاظ سے سورج سے بہت زیادہ مماثل ہیں۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ سورج جیسے کسی بھی ستارہ کے گرد ہماری زمین سے مشابہ پتھریلے سیاروں کی موجودگی کا ۲۰ فیصد امکان ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف ہماری کہکشاں ہی میں زمین جیسے سیاروں کی ممکنہ تعداد ۶/ارب (۶۰۰ کروڑ) تک ہوسکتی ہے۔ڈاکٹر جیمی نے اس پر یہ کہا کہ ’’یعنی زمین پر رہنے والے تقریباً ہر انسان کے لیے پورا ایک سیارہ ہماری کہکشاں میں ہی دستیاب ہے‘‘۔(انقلاب وارانسی،۲۳ جون ۲۰۲۰ء،ص ۷)

’’جراثیم کش ماؤتھ واش کی ایجاد‘‘

فن لینڈ کے سائنس دانوں نے ایک ایسا ماؤتھ واش ایجاد کرلیا ہے جو روشنی کی مدد سے منہ

میں موجود ۹۹ فیصد مضر جراثیم کو ہلاک کردیتا ہے تاہم اس سے صحت بخش جراثیم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس ماؤتھ واش میں ایک قسم کا مرکب (کمپانڈ) شامل ہے جو روشنی جذب کرکے سرگرم ہوتا ہے اور مضر جراثیم کا خاتمہ شروع کردیتا ہے۔ یہ ایک گولی کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ گولی منہ میں رکھتے ہی گھل جاتی ہے اور اگلے ۳۰ سیکنڈ میں یہ ماؤتھ واش دانتوں اور مسوڑھوں سے چپک جاتا ہے۔ پھر ایک خصوصی لیمپ منہ میں رکھا جاتا ہے جسے روشن کرنے کے لیے یو ایس بی سے بجلی فراہم کی جاتی ہے۔ ایل ای ڈیز سے لیس اس لیمپ سے سرخ اور نیلی روشنیاں خارج ہوتی ہیں۔ سرخ روشنی اس جراثیم کش مادے میں کیمیائی ردعمل شروع کرواتی اور نیلی روشنی اس عمل کو بہتر بناتی ہے۔ اس طرح صرف دس منٹ کے اندر دانتوں سے ۹۹ فیصد مضر جراثیم کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ ابتدائی تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس نئے ماؤتھ واش سے ایسے سخت جان جرثومے بھی ہلاک ہوجاتے ہیں جو اینٹی بایوٹک دواؤں سے بھی ختم نہیں ہوتے۔ واضح رہے کہ اس کو آلٹو اور ہیلسنکی یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے مشترکہ طور پر تیار کیا ہے۔ (احمد ٹائمز، حیدرآباد، مارچ ۲۰۲۰ء، ص ۲۱)

"نورہ یونیورسٹی میں چینی زبان کی تعلیم"

امیرہ نورہ یونیورسٹی، سعودی عرب کی پہلی سرکاری گرلز یونیورسٹی ہے۔ خبر ہے کہ اس یونیورسٹی میں چینی زبان کو پہلی بار باقاعدہ کورس میں داخل کیا گیا ہے۔ بیجنگ لینگویجز یونیورسٹی اور شہزادی نورہ یونیورسٹی کے مابین معاہدہ میں طے کیا گیا ہے کہ ریاض میں چینی لینگویجز فار بزنس ڈپلومہ پروگرام کرایا جائے گا۔ یونیورسٹی کی چیئرپرسن پروفیسر ڈاکٹر ایناس العیسیٰ اور بیجنگ یونیورسٹی کے چیئرمین ڈاکٹر لی لیو نے آن لائن پروگرام کے دوران معاہدہ پر دستخط کیے۔ دونوں یونیورسٹیاں دونوں ملکوں کے درمیان تعلیمی و علمی اور ثقافتی تبادلے کو بھی فروغ دیں گی۔ اس معاہدہ کی تقریب میں سعودی سفارت خانہ کے کلچرل اتاشی ڈاکٹر فہد الشریف، سکریٹری تعلیم برائے عالمی تعاون ڈاکٹر صالح القسومی اور بیجنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر گانگ ڈوجون کے ساتھ امیرہ نورہ یونیورسٹی کی ٹیم میں سکریٹری برائے تعلیمی امور ڈاکٹر نوال الرشید، سکریٹری اکیڈمی امور اعمال الہبدان، سماجی خدمات کی ڈین ڈاکٹر لطیفہ آل فریان اور ڈاکٹر ہدیل الصالح شامل تھیں۔ (روزنامہ اردو نیوز ڈاٹ کام، ۲۶ جون ۲۰۲۰ء)

ک۔ ص۔ اصلاحی

تلخیص و تبصرہ

دیسنہ لائبریری کی داستان

ڈیوڈ بوئیک

تلخیص: پروفیسر محمد سجاد

نوٹ: یہ مضمون موناش یونیورسٹی، آسٹریلیا کے موقر جریدہ، ساؤتھ ایشیا جرنل آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، مئی ۲۰۲۰ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ جو جنوبی ایشیا کے کتب خانوں پر ایک خاص نمبر ہے۔ بوئیک نے پٹنہ کے اردو معاشرے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے اور اس وقت وہ امریکہ کی نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی میں ایشیائی زبان و تہذیب کے مدرس ہیں۔ یہاں اس انگریزی مضمون کی اردو تلخیص پیش ہے۔

صوبہ بہار کی راجدھانی پٹنہ سے ۶۵ کلومیٹر جنوب مشرق میں اور بہار شریف سے ۱۴؍کلومیٹر کی دوری پر بسا گاؤں دیسنہ دینی، ادبی و دیگر علوم میں مشاہیر پیدا کرنے کی وجہ سے خاصا معروف ہے۔ سید شہاب الدین دسنوی کی آپ بیتی دیدہ و شنیدہ (۱۹۹۳ء) سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جیرئین ندی کے کنارے بسی اس بستی کی شہرت بہت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شمالی ہند کے دوسرے قصبوں ہی کی طرح دسنہ میں بھی مسلم خواص اور دانشور تھے لیکن دیگر قصبوں کے مقابلے میں دسنہ کا امتیاز یہ تھا کہ یہاں ایک اہم لائبریری بھی تھی، جسے الاصلاح لائبریری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہاں ہزاروں کتابوں کا کلیکشن تھا۔ ان میں بیشتر اردو میں تھیں۔ یہ لائبریری کسی ایک فرد کے بجائے اس قصبے کی اجتماعی کاوش کا ثمرہ تھی، جس کے ارد گرد نو آبادیاتی، ناموافق حالات میں دیہی مسلمانوں کے خواص نے اپنی تہذیبی شناخت کے تحفظ کے لیے قابل ستائش اقدام کیے۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں اس بستی یا قصبہ میں ایک انجمن یا کلب کا قیام ہوا، اس انجمن کا پہلا نام

شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مذاکرۂ علمیہ رکھا گیا اور ۱۹۰۴ء میں اسے "انجمن الاصلاح" کا نام دیا گیا۔ اس میں دسنہ کے بشیر الحق اور عبدالحکیم خاص طور پر پیش پیش تھے جو سرسید کے اصلاحی خیالات سے متاثر تھے۔

اسی انجمن نے یہ لائبریری قائم کی تھی۔ کچھ نوجوان آپس میں کتابوں کی لین دین اس شعور کے ساتھ کرتے تھے کہ تعلیم، تہذیب اور تربیت ایک مہذب زندگی کا اہم ترین پہلو ہے۔ (عبدالقوی دسنوی، مرتبہ "ایک اور مشرقی کتب خانہ: کتب خانہ الاصلاح"، دسنہ، پٹنہ ۱۹۵۴ء)

عبدالحکیم کے مکان کے ایک کمرے سے یہ لائبریری شروع ہوئی اور پھر اسے امام باڑہ کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس انجمن نے کم وقفے ہی میں اردو کتابوں اور رسالوں کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا کر لیا یعنی ۱۹۰۵ء ہی میں ۸۰۰ سے زائد کتابیں اور ان کے علاوہ متعدد رسائل جمع کر لیے گئے تھے، ۱۹۳۰ء کی دہائی میں یہ تعداد چار ہزار سے بھی زیادہ ہو گئی تھی اور تب صوبائی حکومت سے کچھ امداد بھی ملنے لگی اور اس کی اپنی عمارت قائم ہو گئی۔ ۱۹۶۰ء میں جب یہ پٹنہ منتقل کی گئی تب آٹھ ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں۔ اردو، عربی، فارسی، انگریزی کے علاوہ ہندی کی کتابیں بھی اس کلکشن میں آچکی تھیں۔ ۱۵۰ سے زیادہ مخطوطات (Manuscript) تھے۔ اردو زبان کے تقریباً سبھی اہم رسائل کی مکمل فائلیں اور جلدیں دستیاب تھیں اور ۱۹۱۸ء میں جمعیۃ الطلبہ کا بھی قیام ہوا۔ قصبہ کے قبرستان کی دیکھ ریکھ اور شادیوں کے لیے برتن وغیرہ کی سہولت فراہم کرنے کی ذمہ داریاں بھی اب یہ ادارہ ادا کرنے لگا تھا۔

بشیر الحق تو اپنے بچپن سے ہی اس کام میں سرگرم تھے جو بعد میں پولیس انسپکٹر بن گئے۔ نجیب اشرف ندوی نے کلکتہ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے کلیکشن اور خیام کی رباعیات (سولہویں صدی عیسوی) کا نادر کلیکشن بھی لا کر اس لائبریری کی زینت بڑھائی۔

دیگر لوگوں کی اجتماعی خدمات اور علمی دلچسپی کا ذکر "دیدہ وشنیدہ" میں تفصیل سے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس نے حکیم چچا یا حکیم بھائی کے حکم کی تعمیل نہ کی سمجھو کہ وہ اپنے وطن دسنہ کا نہیں مانا جائے گا، اس طرح دسنہ کے لوگوں کا اپنے قصبہ یعنی وطن سے گہرے جذباتی لگاؤ کا ذکر ملتا ہے۔ جس کو گاؤں یا موضع کہہ کر پکارتے تھے اور ایک اجتماعی شناخت کے طور پر اس تعلق کا اظہار کرتے تھے۔

اس انجمن کے سالانہ جلسوں میں نہ صرف دسنہ کے لوگ (جو ملک کے مختلف علاقوں میں رہ

رہے تھے) بلکہ شمالی ہند کے دانشور اور سیاست دانوں کی بھی شرکت ہوا کرتی تھی۔راجندر پرشاد، شفیع داؤدی، شوکت علی، سید محمود، جے بی کرپلانی وغیرہ نے اس لائبریری اور اس انجمن کی علمی سرگرمیوں کی تعریفیں کیں۔انجمن ترقی اردو کے بانی مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۸ء میں کہا کہ اردو کتابوں اور رسالوں کا جیسا کلیکشن دسنہ لائبریری میں ہے ویسا تو بڑے شہروں کی لائبریریوں میں بھی نہیں۔

شروع میں اہل دسنہ نے اس ادارے کو ہندی کی ،اردو مخالف رویے کی مزاحمت کرتے ہوئے اردو تہذیب کے دفاع اور ترقی کے لیے ایک اہم مرکز اور ادارہ کے طور پر دیکھا اور پیش کیا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں کا یہ وہ عہد تھا جب اردو اور ہندی اور ہندو اور مسلمان کے درمیان فرقہ وارانہ اختلافات ظاہر ہو رہے تھے، اس عہد میں قائم کی گئی تھی۔دوسری لائبریریوں ہی کی طرح اس لائبریری کو بھی دانشورانہ اور سیاسی جنگ لڑنے کا آلہ کار کے طور پر دیکھا گیا۔اہل دسنہ کو اپنے اس رول پر فخر تھا اور یہ افتخار اس عہد کے ہندوستان کے اردو بولنے والے مسلمانوں کے شبہات، خدشات (Anxieties) اور توقعات (Aspirations) کی بھی غمازی کر رہا تھا اور اس طرح وہ لوگ اعلیٰ نستعلیق اردو تہذیب کے محافظ کے طور پر اس ادارے کی آبیاری کر رہے تھے۔

تقسیم ہند نے شمالی ہند کے مسلمانوں کو کئی طرح سے متاثر کیا۔دسنہ اور اس کی لائبریری بھی متاثر ہوئی۔ یوں تو اس قصبہ میں تشدد اور خونریزی نہیں ہوئی لیکن دسنہ کے کئی لوگ پاکستان ہجرت کر گئے۔ جو لوگ یہاں رہ گئے ان کو اس لائبریری کے مستقبل کی فکر ہونے لگی۔سنہ ۱۹۶۰ء میں اس لائبریری کو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں دسنہ کلیکشن کے نام سے یہ سیکشن جانا جاتا ہے۔اس پر آج بھی دسنہ والوں کو بجا طور پر فخر ہے اور یہ افسوس بھی ہے کہ دسنہ سے اس لائبریری کو منتقل کرنا پڑا۔کراچی میں دسنہ ویلفیر ایسوسی ایشن ہے جس سے ہندو پاک اور دیگر ممالک میں بسے دسنوی لوگ یا دسنہ سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

اترپردیش کے قصباتی مسلم خواص کی طرح ہی دسنہ کے مسلم خواص بھی اپنے اجداد کو مغل حکمرانوں کی عطا کی ہوئی جاگیروں اور منصوبوں سے تعلق رکھنے والا بتاتے ہیں، گو کہ ان کے مطابق وہ لوگ مغلوں سے قبل ہی یہاں آکر بس گئے تھے۔

دسنہ سے ۱۹ویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں کئی دانشور اور ادیب پیدا

ہوئے۔ان میں سے زیادہ شہرت سید سلیمان ندوی کو ملی جو مورخ، دینی علوم کے دانشور، دارالمصنّفین یعنی شبلی اکیڈمی کے رسالہ معارف کے بانی اور علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد خاص کے طور پر معروف ہیں۔ کئی اور دسنوی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) جیسے معروف اداروں سے تعلق اور کئی معروف رسالوں میں لکھنے کی وجہ سے گیا، لاہور، اورنگ آباد وغیرہ جیسے دور اور نزدیک خطوں میں شہرت واحترام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ایسے ہی رسالوں میں ایک رسالہ "الپنچ پٹنہ" تھا جس سے دسنہ اور استھانواں کے لوگ کئی طرح سے منسلک تھے اور اس طرح گاؤں، قصبات، شہروں کو آپس میں جوڑ کر ایک صوبائی اردو پبلک دائرۂ کار کی تعمیر کی یعنی دسنہ ایک دور افتادہ بستی تھی لیکن اہل دسنہ نہ تو علاحدگی (Isolation) کے شکار تھے اور نہ ہی علمی واصلاحی اعتبار سے تساہل کے شکار تھے۔اپنی تہذیبی، اصلاحی، علمی وادبی سرگرمیوں کے لیے یہ لوگ نہ تو بڑے شہروں پر منحصر تھے نہ ہی وہ ان کی طرف کسی امید سے دیکھتے تھے۔

اس طرح دسنہ کا یہ ادارہ ایک زوال آمادہ قوم کو اس کی پست ہمتی اور حوصلہ شکن اور مایوس کن حالات سے نکال کر تعلیم واصلاح کی ضرورت اور خود اعتمادی بحال کرنے کا ایک نایاب طریقہ تھا، جس کے تحت مستشرقین کی اسلام سے متعلق تنقیدوں کا دانشورانہ جواب دینے والے دانشور تیار کرنے کے آلہ کار کے طور پر اس ادارے کو دیکھا جارہا تھا۔

خدابخش خاں بھی پٹنہ میں یہی کررہے تھے لیکن دسنہ میں یہ کسی ایک شخص کے بجائے پوری بستی کی اجتماعی کوشش تھی اور رضا لائبریری رام پور سے بھی مماثلت کے باوجود یہ مختلف یوں تھی کہ دسنہ کی لائبریری کو سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات کی مالی امداد، سرپرستی یا پشت پناہی حاصل نہیں تھی۔

عبدالحکیم کے مطابق دسنہ میں مدرسہ قائم کرنے کا ایک اضافی مقصد یہ بھی تھا کہ تعلیم کی غرض سے بچوں کو شہر بھیجنے پر شہری مادیت کے زیر اثر بچوں میں اخلاقی پستی آنے کا خدشہ رہے گا، کھانا بہتر نہ ہونے کی وجہ سے صحت خراب ہوگی۔گاؤں کے مدرسہ میں کرتا پاجامہ اور سلیپر چپل سے بھی کام چل جائے گا، جب کہ شہر میں کوٹ پتلون اور جوتے پہننے پڑیں گے اور بازار کی مٹھائی دیکھ کر جو لالچ آئے گی اور انہیں خریدنے کی استطاعت نہ ہوگی تو پھر یا تو بچوں کی حوصلہ شکنی ہوگی، مایوسی ہوگی، غربت کا احساس ہوگا یا پھر چور اچکے بن جائیں گے۔

بہرکیف ۱۹۴۷ء میں جو ملک کا بٹوارہ ہوا، اس کے لیے دسنہ کے لوگ ذہنی طور سے تیار نہیں تھے۔ شہاب الدین دسنوی کے مطابق دسنہ کے مضافات میں ۱۹۴۵ء کے فسادات کا گہرا اثر پڑا، گرچہ دسنہ میں کوئی فساد نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کے اردگرد فوجیوں کا حصار کھڑا کر دیا گیا۔ خوف کا ایک ماحول تھا۔ دسنہ کے کئی لوگ پاکستان ہجرت کر گئے۔ ذاکر حسین ۱۹۵۷ء میں بہار کے گورنر مقرر ہوئے اور شہاب الدین دسنوی بمبئی سے انہیں خطوط لکھ کر انہیں دسنہ لائبریری کے تحفظ کے لیے آمادہ کرنے لگے۔ گورنر صاحب نے وہاں آنے کا وعدہ اور وقت دیا۔ ان کے خیر مقدم کے لیے ملک کے مختلف شہروں میں مقیم اہل دسنہ اپنے گاؤں (وطن) آئے تو ایسا لگا کہ دسنہ کی ویرانی اب پھر سے اسی پرانی چہل پہل میں تبدیل ہوگئی لیکن یہ تو بجھتی شمع کی آخری لو کے مانند تھی۔

لائبریری کی بہتر دیکھ ریکھ کے لیے اہل دسنہ کا ایک گروپ اسے پٹنہ منتقل کرنے کے لیے گورنر صاحب سے رجوع کرتا رہا تو دوسرا گروپ اس کی مخالفت کرتا رہا لیکن ۱۹۶۰ء میں بالآخر اسے خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں اب اسے سرکاری فنڈ کی مدد سے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ جذباتی طور پر اس منتقلی کا کرب اور ماتم انہیں بھی ہوا جو اسے پٹنہ منتقل کروانے میں پیش پیش تھے۔ صباح الدین عبدالرحمٰن نے ''یار عزیز'' میں بشیر الحق نام کے پولیس کی نوکری سے سبک دوش دسنہ لائبریری کے اس اہم ترین نگراں کے جذبات اور کرب کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

''بشیر الحق لائبریری کی منتقلی کے غم کو عبور کر لینے کے بعد اکثر پٹنہ جاتے اور خدا بخش لائبریری کے دسنہ سیکشن میں ہر شام جا کر ویسے ہی بیٹھ جاتے جیسے وہ اپنے گھر پر آرام سے بیٹھتے اور اسی طرح اس انجمن میں خلوت اور جلوت میں کام کرتے تھے''۔

وفیات

خولیوانغیتاگونزالس

قرطبہ کا سرخ خلیفہ

فردوس گم گشتہ اندلس کا ذکر آتا ہے تو بے اختیار مولانا حالی کا وہ مرثیہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے جو انہوں نے دہلی کی بربادی کے بعد لکھا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ آنسوؤں میں گندھا ہوا ہے۔ اگر ہم ان کے شعر میں تھوڑا سا تصرف کرلیں تو فنی سقم کے باوجود شاید ان کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ ایک عرب شاعر کے بقول:

فقلت له انّ الشجیٰ یبعث الشجیٰ   فدعنی فھذا کله قبر مالك

چنانچہ اس سلسلہ میں ان کے جذبات بھی وہی رہے ہوں گے جو ہمارے ہیں بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ اس لیے کہ شاعر بہت حساس ہوتا ہے:

تذکرہ اندلس مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ   نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

سید یحییٰ قرطبی اندلسی نے اندلس کا ایک بڑا دلدوز مرثیہ لکھا تھا۔ "مرثیہ مصائب اندلس" کے نام سے سرسید نے اس کا ترجمہ کیا تھا اور اپنے ایک طویل نوٹ کے ساتھ ۲۶ جنوری ۱۸۷۸ء کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا۔ یہ غالباً اپنی نوعیت کی پہلی کاوش تھی۔ یہ مرثیہ شذرات سرسید میں شامل ہے جسے دارالمصنّفین نے شائع کیا ہے۔

پہلے ۱۲۳۶ء میں قرطبہ کی بربادی اور پھر ۱۲۹۶ء میں غرناطہ سے مسلمانوں کی بے دخلی ایسے واقعات ہیں جو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ جو وہاں سے نکل نہیں سکے ان کے ساتھ ایسے انسانیت سوز مظالم کیے گئے اور صدیوں تک کیے جاتے رہے جن کا تصور بھی محال ہے۔ اندلس میں بچے کھچے مسلمانوں نے جن کو مورسکو (Morisco) کہا جاتا ہے صدیوں پر پھیلے ہوئے طویل عرصہ میں جو مظالم سہے ہیں ان کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ اندلس کا مذہب کیتھولک عیسائیت قرار پایا، اس سرزمین پر کسی اور مذہب کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کردیا گیا۔ مسجد قرطبہ کو بہت توڑ پھوڑ کر

گرجا میں تبدیل کر دیا گیا۔اس علاقہ کا نام ہی Conquista رکھ دیا گیا جس کے معنی ہیں فتح۔گویا یہ اندلس کی عیسائی فتح کی سب سے اہم علامت تھی۔

عہد حاضر میں اسپین کے فوجی ڈکٹیٹر فرانکو (Francisco Franco-1892-1975) کا دور حکومت خاص طور سے بدنام زمانہ ہے۔دانشوروں اور روشن خیال لوگوں کے لیے اس کا نام ہی ظلم و ستم کی علامت بن گیا تھا۔کسی کو یہ آزادی نہیں تھی کہ کیتھولک عیسائیت کے علاوہ کوئی اور مذہب اختیار کر سکے۔مذہبی آزادی یکسر مفقود تھی۔اس نے نازی جرمنی اور فاشسٹ اٹلی سے اتحاد کیا۔

۱۹۷۶ء میں فرانکو کے انتقال کے بعد اندلس میں جمہوریت بحال ہوئی۔اسے سیکنڈر پبلک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔نئے نظام کے نفاذ کے بعد سب سے پہلے قرطبہ کی میونسپل کونسل کا انتخاب ہوا۔اس انتخاب میں قرطبہ کے میئر کی حیثیت سے جس شخصیت کا انتخاب ہوا وہی ہماری اس مختصر تحریر کا موضوع ہے۔اپنی بے مثال مقبولیت اور ایوان میں غیر معمولی اکثریت نیز مسلمانوں کے لیے انہوں نے جو کام کیے ان کی وجہ سے لوگ ان کو سرخ خلیفہ (Red Caliph) کے نام سے یاد کرنے لگے۔سرخ اس لیے کہ وہ کمیونسٹ تھے۔برصغیر کے مسلمان ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں اور نہ ان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔آئندہ سطور میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

میئر خولیو (Julio Anguita Gonzales) کی پیدائش ۲۱ نومبر ۱۹۴۱ء کو ہوئی۔خاندانی پس منظر عسکری تھا۔بارسیلونا یونیورسٹی سے تاریخ میں ڈگری حاصل کی اور تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہو گئے۔اس وقت جنرل فرانکو کی سخت گیر پالیسیوں کی وجہ سے دانشور اور حسّاس لوگ کمیونزم کی طرف مائل ہو جاتے تھے اور نظام وقت کے خلاف بغاوت کے جذبات ان کے دل و دماغ میں پرورش پانے لگتے تھے۔یہی کچھ خولیو کے ساتھ ہوا۔۱۹۷۳ء میں انہوں نے کمیونسٹ پارٹی جوائن کر لی۔پھر وہ جلد ہی پارٹی کے جنرل سکریٹری کے اہم عہدہ پر فائز ہو گئے۔۱۹۸۹ء سے ۲۰۰۰ء تک یونائٹیڈ لیفٹ کے کوآرڈی نیٹر رہے۔اسی دوران وہ میڈرڈ سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ملکی اور سیاسی نقطہ نظر سے یہ سب بڑی کامیابیاں ہیں لیکن عالم اسلام میں بالخصوص جن کاموں کے لیے وہ جانے اور پہچانے گئے وہ انہوں نے قرطبہ کے میئر کی حیثیت سے انجام دیے۔

سیکنڈر پبلک دراصل فرانکو کے طویل ظالمانہ دور کے بعد تازہ ہوا کے ایک جھونکے کی حیثیت رکھتی تھی۔اس کے زیر اثر جمہوریت کی بحالی کے علاوہ نئے دستور میں دوسرے مذاہب کی آزادی کو بھی

تسلیم کیا گیا تھا۔یہی وہ لمحہ تھا جس کا مسلمان نہ جانے کب سے انتظار کررہے تھے۔دراصل اسپین کی تاریخ کے خصوصی پس منظر میں یہ بہت بڑی پیش رفت تھی۔اس سے پہلے جو مسلمان وہاں رہتے تھے وہ اپنے تشخص کو چھپاتے تھے یا با قاعدہ عیسائیت قبول کر لیتے۔اب مسلمان بھی اسپین کے قانونی شہری تھے۔ نئے دستور کے زیر اثر سب سے پہلا الیکشن قرطبہ کے میئر کا ہوا۔اس میں خولیو بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔انہوں نے اپنے پہلے ٹرم میں جو کام کیے اور جو نیک نامی اور مقبولیت حاصل کی اس کے نتیجہ میں جب وہ دوبارہ الیکشن کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کو غیر معمولی اکثریت حاصل ہوئی۔پھر انہوں نے جو کام کیے اور مسلم دوستی کا جو مظاہرہ ان کی طرف سے ہوا،اس کی وجہ سے عوام ان کو سرخ خلیفہ کے نام سے یاد کرنے لگے۔ قدیم اسلامی دارالسلطنت کے میئر کے لیے یہ خطاب کتنا معنی خیز ہے اس کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

عہد جدید میں اسپین میں قومیت کا جو تصور ابھرا ہے اس میں وہاں کے مسلم ماضی سے وابستگی اور اس پر فخر کا احساس بھی ایک اہم عنصر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا ہے۔اقبال جب یہ کہتے ہیں:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

تو اس میں مبالغہ کا کوئی پہلو نہیں ہے۔اس کے مظاہر زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتے ہیں۔انہی جذبات کے زیر اثر ۱۹۷۲ء میں اس وقت کے میئر کوزمین رانیہ نے یونسکو سے مطالبہ کیا تھا کہ مسجد کبیر کو ورلڈ ہیومن ہیریٹیج میں شامل کیا جائے اور اس کی مسجد کی حیثیت بحال کی جائے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ مسجد قرطبہ جو فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے اس وقت تک اس فہرست میں شامل نہیں تھی اور نہ اس وقت تک اس سلسلہ میں جو کوششیں کی گئیں وہ بارآور ہوئیں۔مسجد کبیر کو مسجد کی حیثیت سے بحال کرنے کے موضوع پر کافی بحث ومباحثہ ہوا۔مسجد میں اسے چرچ بنانے کی وجہ سے جو تبدیلیاں آئی تھیں ان کو درست کرنے میں ۱۰ ملین ڈالر کے اخراجات کا تخمینہ تھا۔شاہ فیصل مرحوم نے فرانکو کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اس رقم کا انتظام کردیں گے۔یہ پیغام ۱۹۷۳ء میں بھیجا گیا۔لیکن یہ کام ممکن نہیں تھا۔مسجد کی ملکیت چرچ کے پاس ہے اور وہ اس پر کسی قیمت پر راضی نہیں ہوسکتا۔

اسپین کا نیا دستور ۱۹۷۹ء میں نافذ ہوا۔۱۹۸۰ء میں اسپین کی سرزمین پر تمام ادیان کی آزادی پر اتفاق رائے ہوگیا۔اب مسلمان بحیثیت مسلمان وہاں کے شہری ہوسکتے تھے۔پروفیسر علی المنتصر الکتانی جن کی کتاب ''الانبعاث الاسلامی فی الاندلس'' سے اس مضمون کے لیے بیشتر مواد

حاصل کیا گیا ہے۔ پہلے ہی سے وہاں کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں وہ قرطبہ آئے اور وہاں کے مسلمانوں سے ملے۔ نئے قوانین کے تحت انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ایک میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں ''جمعیۃ قرطبہ الاسلامیہ'' کی تشکیل عمل میں آئی۔ البتہ رجسٹریشن کے وقت ضرورت کے لحاظ سے اس میں جزئی طور پر کچھ تبدیلیاں کردی گئیں۔ اب اس کا نام ''جمعية قرطبه الاسلاميه ومقاطعاتها'' رکھا گیا۔

اسی دوران نئے قوانین کے تحت ہونے والا الیکشن میں خولیو بھاری اکثریت سے میئر چن لیے گئے اور یہیں سے اندلس میں اسلامی تشخص کو ایک نئی جہت ملنے کے اسباب پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں پروفیسر علی کتانی نے ان کو تبریک کا ایک خط لکھا اور اس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ قرطبہ کے حدود میں مسلمانوں کو کوئی ایسی جگہ مہیا کرائی جائے جہاں وہ مل جل سکیں اور اپنے مذہبی شعائر ادا کرسکیں۔ ۱۸رستمبر ۱۹۸۰ء کو میئر خولیو نے لکھا کہ اسپین کے عالم اسلام سے تعلقات کے پیش نظر ہماری یہ خواہش ہے کہ ایک مسجد مسلمانوں کے حوالہ کردی جائے جہاں وہ اپنے مذہبی شعائر انجام دے سکیں۔ پروفیسر کتانی کے اظہار تشکر کے جواب میں میئر خولیو نے ۶راکتوبر ۱۹۸۰ء کو ان کو ایک خط لکھا اور انہیں قرطبہ آنے کی دعوت دی تاکہ متعلقہ معاملات پر بالمشافہ گفتگو کی جاسکے۔ چنانچہ پروفیسر کتانی اور میئر خولیو کے درمیان ۲۴ نومبر ۱۹۸۰ء کو پہلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں میئر نے بتایا کہ شہری کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ مسجد القاضی ابوعثمان کو ''جمعیۃ قرطبہ الاسلامیہ'' کے حوالہ کردیا جائے البتہ اس کی مرمت کی ذمہ داری جمعیت کی ہوگی۔ اس ملاقات میں یہ بھی طے پایا کہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۰ء کو پروفیسر کتانی اپنے والد شیخ محمد المنتصر الکتانی کے ساتھ مسجد کی بازیابی کے لیے قرطبہ کا سفر کریں۔

قاضی ابوعثمان نے یہ مسجد عبدالرحمٰن الناصر (۸۹۱-۹۶۱) کے عہد حکومت میں بنائی تھی۔ یہ ایک خاصی بڑی مسجد ہے اور مسجد کبیر سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اس کا طول وعرض ایک ہزار مربع میٹر ہے۔ سن ۱۲۳۶ میں جب سلطان شمس الدین التمش نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھنے کے بعد انتقال کیا، یہاں اسلام کی عظمت کا سورج غروب ہوگیا۔ عیسائیوں نے مسجد کبیر کو شہر کے خاص چرچ اور مسجد قاضی ابوعثمان کو بھی چرچ بنادیا اور اس کا نام سینٹ کلارا رکھ دیا۔ کنیسہ نے بعد میں اس کو کسی وجہ سے حکومت کو فروخت کردیا اور اس طرح اس کی بازیابی کی راہ ہموار ہوئی۔ میئر نے ۲۶ دسمبر ۱۹۸۰ء کو مسجد کی کنجیاں شیخ محمد المنتصر الکتانی کے حوالہ کیں۔ اس کے لیے قرطبہ کے کونسل ہال میں ایک خصوصی

فنکشن کا اہتمام کیا گیا۔ وہاں سے پورا مجمع جس میں جمعیت کے ارکان بھی شامل تھے، مسجد گیا اور وہاں کے بلند مینار سے ساڑھے سات سو سال کے بعد اذان دی گئی۔ کیسا روح پرور منظر رہا ہوگا اور قرطبہ کے درو دیوار پر جو اثرات پڑے ہوں گے جو صدیوں سے اس آواز کے لیے ترس گئے تھے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔

دیدہ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

اس کے بعد نماز جمعہ ادا کی گئی۔ اس فیصلہ کی مخالفت بھی ہوئی اور اسے ایک بہت خطرناک رجحان کی ابتدا کے طور پر دیکھا گیا لیکن میئر اور ارکان اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک تاریخ ساز واقعہ تھا۔ بعد میں میئر خولیو کی کوششوں سے مسجد کبیر کو عالمی اہمیت کے آثار کی فہرست میں شامل کرلیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہوگئے تھے لیکن سیاسی مصالح کی وجہ سے اسے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ البتہ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ایک بار انہوں نے قرطبہ کے اسقف اعظم سے کہا تھا کہ میں تمہارا میئر ہوں لیکن تم میرے اسقف نہیں ہو۔

خولیو نے زندگی کے آخری ایام میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ بہر حال تاریخ میں ان کا نام زریں حروف میں ثبت ہوگیا۔ ۱۶؍ مئی کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اس سرخ خلیفہ کے نام اور کام کو اسپین اور دنیا کے مسلمان احساس تشکر کے ساتھ یاد رکھیں گے۔

فارم۔IV

(رول نمبر۸)

نام پریس:	معارف پریس، اعظم گڑھ	نام پبلیشر:	ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی
مقام اشاعت:	دارالمصنّفین اعظم گڑھ	قیمت:	ہندوستانی
وقفۂ اشاعت:	ماہانہ	پتہ:	دارالمصنّفین اعظم گڑھ
نام پرنٹر:	ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی	ایڈیٹر:	اشتیاق احمد ظلی
قومیت:	ہندوستانی	قومیت:	ہندوستانی
پتہ:	دارالمصنّفین اعظم گڑھ	پتہ:	دارالمصنّفین اعظم گڑھ

نام و پتہ مالک رسالہ: دارالمصنّفین اعظم گڑھ

میں ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی

معارف کی ڈاک

مکتوب ریاض

ریاض، سعودی عرب

۲۵ شوال ۱۴۴۱ھ

مکرمی! السلام علیکم

گذشتہ شمارے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام پروفیسر براؤن کا ایک عربی خط جناب طلحہ نعمت ندوی صاحب نے شائع کیا ہے، تمہید میں انھوں نے سید صاحب کے نام براؤن کے کچھ دوسرے فارسی و عربی خطوط کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو محفوظ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوا گر وہ یہ خطوط بھی معارف میں شائع کر دیں، اس خواہش کے ساتھ زیر نظر خط کے بارے میں ایک وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

براؤن کے خط میں عربی کا ایک مشہور شعر آیا ہے، اس کا مضمون سلسلۂ کلام سے اس طرح مربوط ہے کہ فاضل مترجم کو غالباً یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ یہ دو مصرعے ہیں اور ترجمے میں بھی انہیں اسی طرح درج کیا جانا چاہیے جس طرح براؤن نے اپنی عبارت سے ممتاز کر کے انہیں شعر کی صورت میں لکھا ہے۔

کلثوم بن عمرو عتّابی ہارون رشید کے عہد کا ایک ادیب اور شاعر تھا، ۲۲۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی، کتابوں کی توصیف میں اس کا ایک قطعہ بہت مشہور ہوا، دوسرے مصنّفین کے علاوہ ابن ندیم نے الفہرست اور حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم وفضلہ میں یہ قطعہ نقل کیا ہے۔ براؤن کے خط میں اس کا پہلا شعر اس طرح آیا ہے:

لنا ندماء لانمل حديثهم أمينون مأمونون غيباً و مشهداً

دوسرے مصرعے کا ترجمہ معارف میں یہ کیا گیا ہے:

''موجودگی وعدم موجودگی ہر حال میں وہ امن پسند ہیں اور مامون رہنا اور رکھنا چاہتے ہیں''۔

لفظ امین کا ترجمہ ''امن پسند'' درست نہیں، عربی میں امین کے معنی امانت دار، پرامن، محفوظ اور محافظ کے آتے ہیں، اسی طرح مامون کا لفظ اردو میں محفوظ کے معنی میں مستعمل ہے لیکن عربی میں مامون اس شخص کو کہتے ہیں جس سے دوسروں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو، عتابی کے شعر میں کتابوں کی تین خوبیاں بیان کی گئی ہیں، پہلی یہ کہ ان ہم نشینوں کی گفتگو سے جی نہیں بھرتا، دوسری خوبی ان کی یہ ہے کہ یہ امانت دار ہیں، جو امانت ان کے سپرد کی گئی ہے اس میں وہ خیانت نہیں کرتے۔ کئی مآخذ میں ''امینون'' کی جگہ ''ألبّا'' (لبیب کی جمع) یعنی دانشمند کا لفظ آیا ہے، تیسری خصوصیت ان رفقا کی یہ ہے کہ وہ سامنے ہوں یا غیر حاضر، ان سے کسی ضرر یا ایذا رسانی کا اندیشہ نہیں، ''غیباً ومشہداً'' کا ٹکڑا اسی آخری صفت ''مأمونون'' سے متعلق ہے۔

شعر سے معاً پہلے ایک اور جملے کا ترجمہ بھی محل نظر ہے، سیاست دانوں کے بارے میں براؤن لکھتے ہیں:

''ومللت مما رأیت من السیاسیین المعوج طریقهم الضال رفیقهم''

معارف کا ترجمہ: ''اربابِ سیاست کی صورت حال دیکھ کر میں بیزار اور دل برداشتہ ہو چکا ہوں، وہ بے راہ روی کا شکار ہیں اور کج روی اختیار کر رکھی ہے''۔

اس ترجمے میں بے راہ روی اور کج روی دونوں صفتوں کو ارباب سیاست سے جوڑ دیا گیا ہے جب کہ براؤن نے ارباب سیاست کو کج رو اور ان کے رفقا کو گمراہ قرار دیا ہے۔

امید ہے براؤن کا یہ خط دوبارہ کسی مجموعہ میں شائع کیا جائے گا تو نظر ثانی کے وقت اس وضاحت کو پیش نظر رکھا جائے گا، یہ سطریں اسی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ معارف میں براؤن کے دوسرے خطوط کی اشاعت کا انتظار رہے گا۔

والسلام

محمد اجمل اصلاحی

ادبیات

غزل

☆ڈاکٹر جمیل مانوی

کس قدر اپنی امیدوں پہ پشیماں ہوں میں
تو اسی شہر میں ہے اور پریشاں ہوں میں

ایک خواہش ہے، بہت جس پہ پشیماں ہوں میں
کوئی تجھ سا ہو جسے دیکھ کے حیراں ہوں میں

شہر میں بھیڑ ہے کوتاہ قدوں کی جب سے
اپنے قامت کی درازی پہ پشیماں ہوں میں

بجھ گئے خود مجھے پھونکوں سے بجھانے والے
دل کے طاقوں میں اسی طرح فروزاں ہوں میں

ان کی آنکھیں رہیں تا دیر سلامت مولا!
جن کی آنکھوں کے لیے دید کا ساماں ہوں میں

آج بھی اس کی نگاہوں کے تقاضے ہیں وہی
آج بھی اس کی محبت سے پشیماں ہوں میں

ہاتھ پھیلاتے ہوئے جتنا پشیمان تھا وہ
اپنے انکار پہ اتنا ہی پشیماں ہوں میں

کیسا آرام کہ درپیش ہے پھر اگلا سفر
اور ابھی پچھلی مسافت سے ہراساں ہوں میں

علم و حکمت مرے پرکھوں کی وراثت ہے جمیلؔ
اپنے پرکھوں کی وراثت کا نگہ بان ہوں میں

غزل

☆☆جناب وارث ریاضی

جب سے میں بیگانۂ علم و ہنر ہوتا گیا
جہل کی تاثیر سے نامعتبر ہوتا گیا

قوتِ پرواز بھی کمزور تر ہوتی گئی
بے بسی بڑھتی گئی بے بال و پر ہوتا گیا

بے تحاشا میری رفعت پر زوال آنے لگا
ذکر میری پستیوں کا مشتہر ہوتا گیا

ہر قدم پر سازشیں ہر گام خونِ آرزو
زندگی! تیرا فسانا مختصر ہوتا گیا

بس گیا ہے دل میں اب اندیشۂ خوف و ہراس
ہر خیال خواب و رنگیں مُنتشَر ہوتا گیا

ہر بشر کی زندگی اب موجۂ ظلمت میں ہے
ناخدا اے بحر دانش بے بصر ہوتا گیا

آدمی میں اب کہاں گر کر سنبھل جانے کی تاب
حربۂ جور و تعصب کارگر ہوتا گیا

رہرووں میں احترام ملک و ملت کچھ نہیں
جذبۂ حب وطن زیر و زبر ہوتا گیا

جیسے جیسے ان سے وارثؔ قربتیں بڑھتی گئیں
ان کا اندازِ محبت دردِ سر ہوتا گیا

☆۴۳۰۔گریس اکیڈمی، نور بستی، سہارن پور۔ ☆☆ کاشانۂ ادب سکٹا، دیوراج، مغربی چمپارن (بہار)۔

مطبوعات جدیدہ

اوراقِ پارینہ از ڈاکٹر محمد انوار الحق تبسم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۲۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ایچ او ڈی ۱۶/۱، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔۶، رابطہ کا پتہ: کہف انوار، ایوب کمپلکس، ولیج حیدر نگر بلساز، جی پی لکھنا، پوسٹ آفس مجگاواں، پی ایس قصبہ، ڈسٹرکٹ پورنیہ (بہار)۔۸۵۴۳۳۰۔

گیارہ مضامین ہیں جن میں دو خالص تاریخی حیثیت کے ہیں یعنی پورنیہ کی تاریخ و ثقافت صدیوں کے آئینہ میں اور دوسرا مضمون عہد مغلیہ کی تعمیرات، باقی مضامین خسرو، غالب، علمائے صادق پور، پیر علی شہید، پروفیسر سید حسن عسکری، پروفیسر یوگیندر شرما، پروفیسر قیام الدین احمد، الحاج حیدر علی رحمانی پر ہیں، ایک مضمون البیرونی کی کتاب الہند کے تعلق سے ہے یعنی زیادہ تر مضامین پامال موضوعات پر ہیں لیکن کمال یہ ہے کہ مطالعہ اور تجزیہ کی گہرائی اور سنجیدگی نے قاری کے لیے جیسے معلومات کے نئے دروازے وا کر دیے، پورنیہ بہار کا مشہور ضلع بلکہ خطہ ہے، ایسا خطہ ہے جس کے ذکر سے دیومالائی مہابھارت، ہوین سانگ کا اسطوری سفرنامہ اور بعد کی مشہور تاریخی کتابیں خالی نہیں، فاضل تاریخ داں محقق کا تعلق چونکہ اسی تاریخی سرزمین سے ہے، اس لیے انھوں نے اپنے وطن کے معلومات کے حصول میں واقعی کوئی کمی نہیں اٹھا رکھی، اسلام کی اشاعت کا سبب عام بیانوں کی طرح یہاں بھی مسلم صوفی سنتوں اور ان کی سادہ زندگی کو بتایا گیا ہے، ایک بات اور قابل غور ہے کہ اسلام نے غریبوں اور نچلے طبقوں کے عوام کی زندگی کو زیادہ متاثر کیا، شہروں سے زیادہ دیہاتوں میں اور بڑی ذات والوں سے زیادہ نیچے کے طبقوں میں یہ پھیلا ضرور لیکن فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ یہ نو مسلم اپنے قدیم رسم و رواج اور دیوی پوجا سے خود کو الگ نہیں کر سکے، اسی لیے آگے چل کر بھکتی تحریک کے اثر سے اسلام کا فروغ رکا ہی نہیں، بہت سے نو مسلم اپنے سابقہ مذہب میں واپس آ گئے، یہاں ضرورت تھی کہ مصنف کی تاریخی نظر کچھ اور اسباب بھی تلاش کرتی کہ مزاروں اور پیروں سے بدستور وابستگی کے باوجود یہ ارتداد کیوں ہوا اور مذہبی و سیاسی اقتدار و تسلط بھی اس سلسلہ میں کام کیوں نہ آیا؟ حالانکہ وہ آگے بیان کرتے ہیں کہ مسلم فوجداروں کے عہد حکومت میں اس خطہ میں بڑی خوش حالی تھی، یہاں سلاطین دہلی کے ایسے قلعے تھے جہاں چین اور تبت کے لیے فوجی مہمات روانہ کی جاتی تھیں، مغل حکومت کا آخری زمانہ دہلی

اورنواح کے لیے کیسا ہی شورش زدہ رہا ہو لیکن پورنیہ کے اقتصادی اصلاحات، خوش حالی، امن وقانون کی بحالی کے لیے بقول مصنف یہ دور بے حد اہم تھا، اسی اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں پورنیہ کے ایک مقامی صوفی شاعر شیخ کفایت اللہ نے ایک پریم کتھا ودیا دھر لکھی، اس کو مصنف نے بہار کی لسانی ترقی کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل کتاب سے تعبیر کیا ہے، جیسے جیسے یہ مضمون پھیلتا جاتا ہے ویسے معلومات کا خزانہ جمع ہوتا جاتا ہے، یہ بات بھی ہے کہ کشن گنج، کھگڑا بلکہ اور آگے مرشدآباد و مالدہ یعنی کبھی کے علاقہ لکھنوتی کی تاریخ سے آگاہی کم ہے، ورنہ بہار کی مسلم تاریخ، عجائبات میں کم نہیں، صرف اسی ایک مضمون کے لیے ہی اگر کتاب خریدی جائے تو قاری نقصان میں نہیں رہے گا، البیرونی اور خسرو اوران سے بھی زیادہ علمائے صادق پور کی تاریخ جس دلچسپ انداز میں سنائی گئی ہے اس سے معلومات کے ساتھ فاضل مصنف کی دیدہ ریزی، ژرف نگاہی اور تاریخ کے انجان بلکہ تاریک گوشوں تک رسائی کا علمی دبدبہ بڑھتا جاتا ہے، حالانکہ بعض موقعوں پر بیانیہ قطعی سپاٹ ہے، مثلاً ''کہتے ہیں کہ حضرت محبوب الٰہی کو خسرو سے اس قدر محبت تھی کہ وصیت فرمائی تھی کہ خسرو میرے مزار کے قریب نہ آنے پائیں وگرنہ میرا جسم بے تاب ہوکر باہر آجائے گا''، بہرحال اعلیٰ درجہ کے مطالعہ کی حامل ایسی کتابیں اب کم ہی آتی ہیں اور اس کی وجہ وہی جاں کاہی کی کمی اور جلد سے جلد مصنف کہلانے کا شوق طفلی ہے، ۱۰-۱۱ مضامین کا یہ مجموعہ پچاس سال کی محنت کا نتیجہ ہے، یہ استقامت بجائے خود قابل دید بھی ہے اور لائق داد بھی، گاہے گاہے کیوں، روز و شب باز خواں اوراق پارینہ را۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، افکار و جہات از ڈاکٹر سلیم قدوائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۶۰، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: اردو بک ریویو، ۱۷۳۹/۳، نیوکوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-۲۔

جیسے ابھی کل کی بات ہو، معارف سمیت خدا جانے کتنے رسالوں میں ڈاکٹر ہاشم قدوائی مرحوم کے خطوط اہم مضامین کی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھے جاتے تھے، اردو بک ریویو میں ان کے تبصروں کا انتظار رہتا تھا، جن میں مضامین کے متعلق بے باک رائیں بھی ہوتیں اور حوصلہ افزا مشورے بھی ہوتے، کتابوں اور یہ لفظ محض عام کتاب کی جمع کے طور پر نہیں حقیقتاً ہمہ وقت کتابوں کے مطالعہ میں اچھے اچھوں کا بیان ہے کہ کوئی ان کا ثانی نہیں تھا، وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے حقیقی برادرزادے اور خویش تھے،

مولانا دریابادی کے باب میں تو وہ انسائیکلو پیڈیا تھے، مولانا دریابادی کے خطوط کے قریب آٹھ ضخیم مجموعے انھوں نے جس محنت سے شائع کیے وہ پڑھنے والوں کو حیرت زدہ کرنے کے لیے کافی ہے، اعلام واماکن اور حوادث واحوال پر ان کے حواشی ان کی محققانہ جستجو کی الگ داستان بیان کرتے ہیں، وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات سے سبکدوش ہوئے اور اپنے موضوع پر انھوں نے جو کتابیں لکھیں، واقعہ یہ ہے کہ اب تک ان پر اضافہ نہیں ہوسکا، سیاسی لحاظ سے وہ پکے کانگریسی لیکن مذہبی لحاظ سے علماء سے زیادہ قدامت پسند اور راسخ العقیدہ مگر تحریروں میں کہیں کسی کی دلآزاری نہیں، ملک کے موجودہ حالات کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اس وقت سب سے مقدم بات یہ ہے کہ جو لوگ ملک میں سیکولر جمہوریت اور قومی یکجہتی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، ان کا فرض منصبی ہے کہ وہ ہندو فرقہ پرستی کے مقابلہ میں زبردست جدوجہد کریں، ان کے لیے خوش آئند پہلو یہ تھا کہ بہت بڑی اکثریت ہندو فرقہ پرستی کی حامی نہیں، افسوس تو یہ ہے کہ ہاشم صاحب جیسے سیاسی مفکروں کو عام طور پر ہماری جماعتوں نے نظر انداز کیا، ایسی شخصیت کا تقاضا تھا کہ ان کے حالات پر کوئی کتاب ہو، یہ سعادت ان کے نہایت لائق صاحبزادے کی قسمت میں آئی، کتاب اکابر واصاغر کے مضامین کا مجموعہ ہے اور مختصر بھی ہے، تاہم آئندہ ہاشم صاحب مرحوم پر کسی بھی بڑے کام میں اس کی افادیت بڑی ہی ثابت ہوگی۔

مشاہیر علوم اسلامیہ اور مفکرین ومصلحین از پروفیسر محسن عثمانی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذو طباعت، مجلد، صفحات ۳۱۶، قیمت ۳۲۵ روپے، پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بی۔۳۵، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی۔۱۳۔

کتاب کا عنوان ہی بتا دیتا ہے کہ تین سو صفحات کے کوزہ میں صدیوں کے بحر زخار کی کیسی کیسی موجوں کو سمیٹا گیا ہوگا، سمیٹنا تو یقیناً بجائے خود ایک بڑا مکمل کام ہے لیکن سلیقہ کی صفت اگر اس میں شامل ہوجائے تو پھر اس کے کارنامہ بننے اور ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا، بظاہر یہ نہ تو الفہرست ہے نہ کشف الظنون اور یہ روایتی قاموس بھی نہیں مگر علوم قرآن وحدیث، سیرت نگاری، فقہ، قانون اسلامی، تاریخ، سوانح، تصوف جیسے موضوعات کے قدیم وجدید، عربی، اردو، انگریزی اصحاب قلم کو ہندو بیرون ہند کے خانوں میں جس ہمہ گیر مطالعہ سے پیش کیا گیا ہے وہ بس دیکھنے کے لائق ہے، ایک باب میں مفکرین ومصلحین کا الگ شمار ہے، حضرت حسین بن علیؓ سے ابوالحسن علی تک یہ انتخاب بھی لاجواب ہے، آخر میں

فلاسفہ اور متکلمین میں ایسے نام ہیں جو تاریخ اسلامی کے صدیوں کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، اس پوری مشاہیر شماری میں ہندوستانیت کا پہلو بھی کہیں بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں، علامہ شبلی کے ہیروز آف اسلام کے منصوبے میں جو بھی رہے ہوں اس گلیکسی آف ہیروز سے کمی کا شکوہ بہرحال نہیں، ایسی مفید ترین اور جامع ترین کتاب تیار کرنے بلکہ اس کے لیے عرق ریزی کرنے کی وجہ صرف نظریاتی نہیں، عملی بھی ہے، فاضل مصنف کی زندگی ہی گویا درس وتدریس کے لیے وقف رہی، اس مبارک عمل میں دینی وعصری فرق کو بھی انہوں نے اچھی طرح سمجھا، اس لیے ان کا یہ کہنا عین صداقت ہے اور عبرت کے قابل بھی کہ ''معلوم ہوا کہ دینی مدارس کے طلبہ عام طور پر اپنے علمی خزانوں اور اسلاف کے کارناموں سے باخبر نہیں ہوتے اور طلبہ ہی کیا اس ستم میں بیشتر اساتذہ بھی شامل ہیں''، صحیح لکھا کہ اس ستم کی داد ہے نہ فریاد، یہ بھی المیہ ہے کہ اب دینی مدارس کے فضلا کے قلم سے ایسی علمی کتابیں بہت کم آتی ہیں جنہیں تازہ ہوا کا جھونکا اور گلشن علم کا غنچہ نوشگفتہ کہا جا سکے، اسی سچ نے اس کتاب کے لیے محرک کا کام کیا، فاضل مصنف کا قلم رعنائی تحریر کے لیے معروف ہے، انہوں نے اس کتاب میں خود کی حیثیت ناقل محض کی قرار دی ہے، حالانکہ ان کے تبصرے الفاظ کے اختصار کے باوجود مختصر المعانی نہیں، مولانا دریابادی اور ان کی تفسیر کے تعارف میں صرف چار سطریں ہیں لیکن یہ ایسا متن ہے جس کی تشریح کے لیے سینکڑوں صفحات بھی ناکافی ہو سکتے ہیں، سرسید کا ذکر مفکرین ومصلحین کی فہرست میں ہے، مفسرین میں ان کا عدم شمار، ذوق انتخاب کی خاموش داد ہے، فاضل مصنف کی کتابوں اور ان کے مشمولات سے اختلاف کی تشنگی دور کی جا سکتی ہے مگر یہ کتاب اپنے موضوع ومقصد کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ بطور تیمن ''لاریب فیہ'' کے الفاظ ہونٹوں پر آ سکتے ہیں۔

سچ ہی تو ہے، از ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۳۶۳، قیمت ۳۵۰ روپے، پتہ: میڈیا پلس فاؤنڈیشن، چوتھی منزل، جامعہ نظامیہ کامپلکس روبرو، ایس بی آئی گن فاؤنڈری، عابدس، حیدرآباد اور حیدرآباد کے دیگر مکتبے۔

جب اس قسم کی باتیں پل پل سماعتوں کو پیغام دیں کہ سچ کہنا جتنا مشکل ہے، سچ لکھنا اس سے کہیں زیادہ دشوار گذار مرحلہ ہے، سچ لکھنے والوں کو اپنے اعتراف کی پرواہ نہیں ہوتی، پرواہ تو ضمیر زندہ اور قلب مطمئنہ کی ہوتی ہے جن سے بہتر کوئی اور نعمت نہیں ہوتی تو خود بخود دوسری اور تحریریں دامن گیر ہوتی

ہیں کہ ان کو بھی فکر اور جذبات کی آغوش میں سما لیا جائے، یہ تحریریں حیدرآباد کے نامور صحافی ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کا تعارف بھی ہیں کہ موجودہ صحافت خواہ وہ کاغذی ہو یا آہنی و چوبی ہو، اس کے سامنے ایسا آئینہ لایا جائے جسے دیکھ کر وہ خود کو بھی نہیں پہچان سکے، اخبار گواہ کے اداریے صرف جذباتی نہیں، جذبات کو سچ کی آنچ میں تپا کر پیش کیا گیا ہے، مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے انداز میں ان اداریوں میں متکلم کی وحدت تلاش کی ہے، اس ابہام کی وضاحت بعد کی سطروں سے ہو جاتی ہے کہ پرویز صاحب ذہنی بیداری سے کام لے کر عادت، علت اور عکس کو راہ دیتے ہیں، سچائی کو بنیادی قدر کے طور پر پیش کرتے ہیں، اس طرح جامع عکس سامنے آتا ہے اور وارداتوں کی نئی تاریخ ترتیب پاتی ہے، ہرگانوی صاحب کی یہ ابتدائی تحریر بجائے خود ایک سچے تجزیے کی متقاضی ہے، صحافت کی زبان میں "فائقی تحریر، اونچی سطح کی تمثالی اور بصیرت و پر کیفی، معاشرتی شناسائی اور ثقافتی کوڈز" جیسے الفاظ و تعبیرات صحافت کی دنیا میں ایک نئے لغت کی راہ دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہاں تک تو غنیمت ہے کہ "پرویز صاحب کی تہہ نشیں تحریر کی معنویت میں جگنوئی چمک ہے" بہتر عبارتیں بھی ہیں جیسے وہ خانہ پری کے لیے اداریہ برائے اداریہ نہیں لکھتے، اس لیے ان کے اداریہ سے تقویت اور طمانیت ملتی ہے، یہ باتیں ہرگانوی صاحب کی دانشورانہ تحریر کے بارے میں یوں ہی آ گئیں، ورنہ بات واقعی یہی ہے کہ ایک صحافی کو اپنے پیشے سے انصاف کرتے ہوئے سچ کی آبرو کے تحفظ میں قدم قدم پر خود سے اور سماج سے نبرد آزما ہونا ہوتا ہے، اس وقت بات صرف آبرو ہی کی نہیں اس سے بھی بڑھ جاتی ہے، جب پیش نظر یہ حقیقت ہوتی ہے کہ "صحافت تو صحیفہ سے نکلا لفظ ہے اس لیے صحافیوں کو بھی وہی پیغام عام کرنا ہے جو خاتم النبیینؐ کا مشن تھا"، تو صحافت تقدیس کے مقام پر جا پہنچتی ہے، مسلم علاقوں سے مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے نام پر مسلم جماعتیں زیادہ تر مسلم امیدوار ہی میدان میں اتارتی ہیں، اس رجحان پر یہ لکھنا کہ "ان کی اندرونی سازش یہی ہوتی ہے کہ مسلم ووٹ تقسیم ہو جائے، بکھر جائے اور مسلم حلقوں سے بھی کوئی غیر مسلم امیدوار منتخب ہو جائے، اکثر یہ سازش کامیاب رہتی ہے کیوں کہ ہر الیکشن میں کچھ ضمیر فروش اور قوم فروش اپنے مالی مفادات کی خاطر ووٹ تقسیم کرنے کے لیے ہی میدان میں اترتے ہیں"، اگر یہ سچ ہے تو پوری کتاب سچائی کا اعلان ہے۔

روح سیاست از جناب محمد مظہر الاعظمی، تقدیم ابن احمد نقوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۷۲، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ نعیمیہ، حالات کمپلکس، صدر بازار، مئوناتھ بھنجن، یوپی اور

دہلی، بمبئی، لکھنؤ، حیدرآباد اور سری نگر کے مکتبے۔

ہندوستان کی سیاست بلکہ عالمی سیاست کے رخ اور پہلو ہزار ہو سکتے ہیں، معاشی و تجارتی مقاصد، جغرافیہ و تاریخ کا نقشہ بدلنے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن پل پل بدلتے حالات اور رشتوں کی سچائی جاننے کے لیے موجودہ سیاست کی روح تک پہنچنا ضروری ہے لیکن یہی وہ کلید ہے جو کسی اندھے کنوئیں میں اس طرح جا گری ہے کہ کسی کے ہاتھ نہیں آتی، نتیجہ میں موجودہ سیاست کی بے سمتی، پوری دنیا کو ایک جہنم میں دھکیلنے کے درپے ہے، اس کتاب میں روزمرہ خبروں پر تبصرے ہیں، تجزیے ہیں اور سب میں کوشش یہی ہے کہ حالات کو واقعیت کے آئینہ میں دیکھا اور لکھا جائے، اردو کے سیاسی کالم نگاروں کی ایک تو آواز ہی نحیف سی ہوتی ہے، پھر ان کے ذرائع معلومات بھی وہی ہیں جن کا اعتبار نہیں اور جو صرف طاقتور حکمرانوں کی تائید و توثیق کے لیے پیش کیے جاتے ہیں، پھر بھی دل میں درد ہو، زبان ہوشمند ہو تو حالات حاضرہ پر تبصرے بڑی حد تک سماجی رہنمائی میں معاون ہو سکتے ہیں، اس مجموعہ مضامین کا بھی یہی حال ہے، اس کتاب کا آخری اقتباس جو کئی سال پہلے لکھا گیا تھا آج اپنی صداقت کا اعلان کر رہا ہے کہ ”......حقائق تک نہ پہنچنے کی صورت میں صرف مسلمانوں کا ہی نہیں نقصان ہوگا کانگریس پارٹی کی تصویر بھی بدل جائے گی اور ہندوستان کے استحکام کو بھی خطرہ لاحق ہوگا، کیوں کہ ان سب کے پیچھے ہندتو کا نظریہ کارفرما ہے جو مسلمانوں کے لیے خطرہ کا باعث ہے وہیں ہندوستانی جمہوریت کا بھی متزلزل ہونا یقینی ہے“۔

کاوشِ نم، مرتب جناب علیم صبا نویدی، صفحات ۱۲۸، قیمت ۴۵۰ روپے، پتہ: اشفاق الرحمٰن مظہر، پلاٹ نمبر ۳۰، وردھامل نگر، ریڈ ہلز، چنئی، ٹامل ناڈو۔

ٹامل ناڈو کی شعری روایت کا ایک اہم حصہ کاوش بدری تھے، ویسے وہ اچھے نثر نگار بھی تھے، مگر ان کے احباب اور قدردانوں نے ان کی شاعری کو زیادہ اہمیت دی اور یہ کچھ نامناسب بھی نہیں، جو شاعر یہ کہہ سکے کہ:

ہے مکمل وہ کہانی جو حقیقت ہوجائے　　بات ادھوری ہے اگر شرح معانی ہوجائے

جب سے آلام کے شکار ہوئے　　سینکڑوں راز آشکار ہوئے

میر و غالب، شریف اور کاوشؔ　　ایک ہی تیر کا شکار ہوئے

اچھا ہوا کہ ایسے شاعر کا کلام سلیقہ سے یکجا کیا گیا جس کو احساس تھا کہ: شاعری بس سنبھالتی ہے مجھے، البتہ قیمت غالباً غلط چھپ گئی ہے۔ (ع ـ ص)

رسید کتب موصولہ

اقبال کا حرف شیریں: پروفیسر عبدالحق، ہڈسن لائن کنگس وے کیمپ، دہلی۔ قیمت ۳۰۰/روپے

تیرہ ماسہ: (شمالی ہند کا سب سے قدیم اور مکمل مخطوطہ) اکرم قطبی، مرتبہ پروفیسر عبدالحق نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، مان سنگھ روڈ، نئی دہلی۔ قیمت ۵۰۰/روپے

سوز و گداز زندگی: پروفیسر عبدالحق، اقبال اکیڈمی (ہند)، نئی دہلی۔ قیمت ۵۰۰/روپے

ضرب تبسم: عابد رضا عابدؔ، بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ قیمت ۲۵۰/روپے

عرفان عارف یعنی مجموعہ کلام: مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ، پیشکش ضیاء عبداللہ ندوی، دفتر رابطۂ ادب اسلامی، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں۔

کلیات ولی: مرتبہ پروفیسر عبدالحق نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، مان سنگھ روڈ، نئی دہلی۔ قیمت ۴۰۰/روپے

لفظوں میں احساس: افتخار راغب، پرویز بک ہاؤس، سبزی باغ، پٹنہ۔ قیمت ۷۰/روپے

مسلم اسپین، تہذیبی و ثقافتی تاریخ: ڈاکٹر محمد عمر فاروق، البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت ۳۰۰/روپے

معروضات و مطالعہ: پروفیسر عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر کے۔ پی۔ شمس الدین، اقبال اکیڈمی (ہند)۔ قیمت ۳۰۰/روپے

وفیات مکاتیب مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری: بنام حبیب ریحان ندوی و مسعود الرحمٰن ندوی و بیگم آمنہ سلطان، مرتب مسعود الرحمٰن خاں ندوی، مکتبہ دین و دانش ۔۱۳، مسجد شکور خان روڈ، بھوپال۔ قیمت ۵۰/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس ودبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) ״	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) ״	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) ״	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) ״	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) ״	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) ״	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) ״	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبد السلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول ״	150/-
مکاتیب شبلی دوم ״	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
JULY 2020 Vol - 206 (1)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیرالصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفرالاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-